PDFBOOKSFREE.PK

تعاون

(سچی کہانیاں)

محمد رفیق ڈوگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعاون

کہانیاں

محمد رفیق ڈوگر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ترتیب

	صفحہ
مسز قریشی	7
امانت	18
رولدو	27
گوپی کی موت	39
ساون کی کہانی	48
تعاون	56
سائیں جیوا	64
بیگم اناللہ	71
ہتھیار	79
نقاب پوش	87
راوی کی ریشم	92
حق شناس	98
ڈاکٹر فلورنس	103
توہین	113
زخمی بندر	121

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلی فلو 126
تاریخ کے پھٹ 132
چھوٹا بھائی 146
کرنیل سنگھ 156

مسز قریشی

دھار کی زندگی بیلوں کے قدموں سے بندھی تھی کنویں کے پانی کی اس دھار کی زندگی جسے مسز قریشی کینوس پر رواں دواں کر رہی تھی ملک جلال اس کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا اور مسز قریشی کی نگاہیں پانی کی دھار سے بندھی ہوئی تھیں اور پانی کی دھار بیلوں کے قدموں سے بندھی ہوئی تھی اور میں آنکھیں بند کئے ہری گھاس پر لیٹا ہوا تھا اور پوہ کی دوپہر کی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی

''یہ حرامی آج بھی پینٹنگ مکمل نہیں ہونے دے گا'' مسز قریشی نے غصہ سے پیلٹ زمین پر دے ماری

میں حواس کی دنیا میں واپس آیا تو ہری گھاس پر رنگ بکھرے ہوئے تھے پیلٹ بیلوں کے قدموں میں پڑی تھی مسز قریشی کی آنکھوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور ملک جلال مسکرا رہا تھا میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ملک جلال کو انگریزی نہیں آتی وہ انگریزی جانتا ہوتا تو مسز قریشی اور اس کی ایزل کو کنویں میں پھینک چکا ہوتا اور امریکہ کے فن پرست ہماری زرعی تہذیب کے قدیم نمونوں کے دشنوں سے محروم رہ جاتے بیل چلتے چلتے ایک بار پھر رک گئے تھے پانی کی دھار ٹوٹ گئی تھی اور مسز قریشی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور ملک جلال اس کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا

امریکہ کے فن پرستوں کو ہمارے نابود ہوتے کنویں کی پینٹنگ کی اشد ضرورت تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور مسز قریشی کو ایک عدد کنویں کی بڑی تلاش تھی اور ہم اس تلاش میں راوی کے بیلے میں نکل آئے تھے اور ملک جلال نے اپنی دادی اماں کے محبت پیار کی یاد میں اپنے بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیئے تھے وہ تین اتواروں سے ہمارے لئے کنواں چلا رہا تھا اور انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے مسز قریشی کی گالی پر بھی مسکرا رہا تھا

ملک جلال جنگل بیلے میں راوی کے کناروں پر چرواہوں کے گیتوں کے درمیان رہنے والا نوجوان تھا اور بوڑھی میم کی باتوں پر مسکراتا رہتا تھا ''تمہاری بھینس کا خاوند کہاں گیا؟ اس بیل کا ٹلی کیا گاتا ہے؟ یہ تتلیاں رات کو بھی گندم پر اڑا پھرتی ہیں؟''

مسز قریشی کی گالی کی مانند وہ اس کی ہر بات پر مسکرا دیتا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا کر پانی کی دھار زندہ کر دیا کرتا تھا اس کا کنواں اس کے پانی کی دھار اور بیلوں کی جوڑی امریکہ کے کسی عجائب گھر یا امیر کبیر کے ڈرائنگ روم میں لٹکنے جا رہے ہیں اسے کچھ معلوم نہیں تھا مگر وہ اپنے کنویں کے پانی کی دھار کو کینوس پر بہتا دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوتا تھا اور اب بھی خوشی سے مسکرا رہا تھا اور پیلٹ بیلوں کے پاؤں میں پڑی تھی۔

مجھے بہت دکھ ہوا مسز قریشی کا جلال کب بوڑھا ہوگا؟ میں سوچنے لگا

مسز قریشی نے میری طرف دیکھا تو میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا میں تو اس کی گالی پر ملک جلال کی طرح مسکرا نہیں سکتا تھا وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر ایزل کے پاس پڑی لاٹھی اٹھائی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے سامنے گھاس پر آن بیٹھی سر کو جھٹک کر اپنے کٹے ہوئے بال لہرائے اور مسکرانے لگی اسے ملک جلال کو گالی دینے کا افسوس تھا نہ پیلٹ پر لگے رنگوں کے بکھر جانے کا افسوس تھا ''آپ مجھ پر ایک احسان کریں'' وہ سنجیدہ ہوگئی

میں خاموش رہا

''میں مسٹر بخاری کا ہیڈ پورٹریٹ بنانا چاہتی ہوں اسے کہیں میرے لئے پوز کرے پلیز یہ میری آخری منت ہے''

میں نے کوئی جواب نہ دیا مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ راوی کے جنگل بیلے میں اسے مسٹر بخاری کی یاد اچانک کیوں ستانے لگی ہے ملک جلال بیل ہانکنے چلے گیا تھا بیلوں کے قدموں سے بندھی دھار پھر سے رواں ہوگئی تھی اور مسز قریشی سر جھکائے ہری گھاس پہ بیٹھی تھی ''یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے پتہ نہیں کب مر جاؤں گی مسٹر بخاری کا ہیڈ پورٹریٹ بنائے

بن مر گئی تو مجھے قبر میں بھی آرام نہیں ملے گا پلیز اس سے کہیں میرے لئے پوز کرے''

میرا غصہ پریشانی میں بدلنے لگا

مسز قریشی سے میرا صرف احترام کا رشتہ تھا ایسے احترام کا رشتہ جو ہر آدمی کا ایک بزرگ اور بڑے فنکار سے ہونا چاہیے اسی احترام میں اتنی دور پرانے کنویں کی تلاش میں جنگل بیلا چھان کر میں ایک روز ملک جلال کے کنویں پر نکل آیا تھا اور اس کی پینٹنگ مکمل کرانے کے لئے ہر چھٹی کے دن اسے اتنی دور لے آتا تھا اور ملک جلال اپنے کام چھوڑ کر بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیتا تھا اور مسز قریشی نے اسے اتنی موٹی گالی دی تھی نہیں ملک جلال کو نہیں اس نے تو مجھے گالی دی تھی اور اب وہ مسٹر بخاری کو ہیڈ پورٹریٹ کے لئے پوز کرنے پر آمادہ کرنے کی درخواست پیش کر رہی تھی

لوگ کہتے تھے مسز قریشی کسی کی پرواہ نہیں کرتی کسی کا لحاظ نہیں کرتی لوگ سچ ہی کہتے ہیں؟ میری سوچ کا زاویہ بدلنے لگا تھا اور وہ ہری گھاس پر بیٹھی مسٹر بخاری کے فضائل بیان کر رہی تھی اور میں نے سن رکھا تھا وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھی مسٹر قریشی سے عشق کیا تو بھی اس نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی نہ والدین کی نہ رشتہ داروں کی نہ اپنے معاشرے اور ملک کی اس نے کسی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاہور آ گئی تھی اور پھر اس نے مسٹر قریشی کو بھی چھوڑ دیا تھا ''وہ ناقابل برداشت ہوگیا تھا'' ایک روز قہقہہ لگا کر اس نے مجھے بتایا تھا ''پہلے میں نے قریشی کے لئے سویٹر بننا چھوڑا اور پھر اسے بھی چھوڑ دیا وہ ناقابل برداشت ہوگیا تھا''

اس نے جب مسٹر قریشی کو چھوڑا وہ اس کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا ایسی جوانی اور حسن کا زمانہ جب لوگ شمع پر پتنگوں کی مانند اس پر قربان ہونا چاہتے تھے اور وہ سارے ہی پتنگے اس سے خوف کھایا کرتے تھے اور مسز قریشی کسی کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس پر قربان ہو جائے اس کی زندگی فن کے گرد گھومتی تھی مصوری، مجسمہ سازی، بحث مباحثے، مذاکرے، درس و تدریس اور پھر لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے تھے مگر اس نے کسی بات کی بھی پرواہ نہیں کی تھی

کیا واقعی مسز قریشی پاگل ہی تو نہیں؟ اگر وہ پاگل نہ ہوتی تو پرانے کنویں کی تلاش میں اس جنگل میں کیوں آتی؟ لوگ اس بیلے کی طرف آنے کا سوچ کر کانپ جاتے ہیں اور وہ چھ دن چھٹی کے انتظار میں گزارتی ہے اور اسے ذرا بھی خوف نہیں آتا میں سوچتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک چھٹی کے دن میں نے مصروفیت کا بتایا تو وہ غصہ میں آ گئی تھی ''میں لعنت بھیجتی ہوں امریکی ڈالروں پر پینٹنگ کی جتنی رقم ملے گی میں قریبی گاؤں کے بچوں کے سکول کے لئے اس سے ٹاٹ خریدوں گی مجھے ڈالروں کی کچھ بھی پرواہ نہیں مجھے فن سے عشق ہے میں نے تو فن سے عشق میں مسٹر قریشی سے شادی تک کر لی تھی یہ فن میرے خون میں شامل ہے تم کیا سمجھتے ہو میں نے مسٹر قریشی سے عشق کیا تھا؟ میں نے تو اس کے فن سے عشق کیا تھا''

کوئی فنکار کسی دوسرے فنکار کو اپنے سے بڑا سمجھے اور اس کا اظہار بھی کرے یہ بہت مشکل کام ہے مگر مسز قریشی مسٹر قریشی سے علیحدگی کے باوجود اسے بہت بڑا فنکار سمجھتی تھی اور اس کا کھلے عام اظہار بھی کرتی رہتی تھی

جس روز وہ مسٹر قریشی سے سول میرج کرنے عدالت گئی تھی سارا لندن خندقوں میں دبکا ہوا تھا جرمن طیارے شہر پر بارود کی بارش کر رہے تھے اور وہ عدالت میں مسٹر قریشی کے فن سے سول میرج کے فارم پر دستخط کر رہی تھی اور پھر اس نے مسٹر قریشی کو چھوڑ دیا تھا ویسے ہی جیسے اس نے سویٹر بننا چھوڑ دیا تھا

ایک روز بتایا ''ایک بار میں نے کراچی میں اپنی پینٹنگز کی نمائش لگائی مسٹر قریشی بھی دیکھنے آیا اور سب کے سامنے میری پینٹنگز کو گھٹیا قرار دیا مجھے معلوم ہوا تو میں نے اسے بہت گالیاں دیں سب کے سامنے تاکہ وہ جا کر اسے بتائیں ''

''آپ اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز کو گھٹیا کہہ لیتیں گالیاں دے کر خواہ مخواہ اپنا منہ گندا کیا'' میں نے کہا

اس نے قہقہہ لگایا ''میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی مسٹر قریشی بہت بڑا فنکار ہے''

''اب کے کراچی گیا تو میں مسٹر قریشی کو بتاؤں گا کہ آپ اسے کتنا یاد کرتی ہیں''

اس نے برش دور پھینک دیا ''میں سو بار لعنت بھیجتی ہوں مسٹر قریشی پر''

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا خراب ہو جائے گا وہ مٹی کے تودے کی مانند کرسی میں ڈھیر ہو گئی تھی ''جب میں نے مسٹر قریشی کو چھوڑا تھا اس وقت میرا بیٹا چار سال کا تھا میں نے آج تک اپنے بیٹے کو اس کی منحوس شکل نہیں دیکھنے دی'' پھر اس نے پانی کا گلاس منگوایا ایک گلاس کے بعد پانی کا ایک اور گلاس پیا اور آنکھیں بند کر لیں

مسز قریشی بڑی جانباز خاتون تھیں مسٹر قریشی سے علیحدگی کے بعد آدمیوں کی بھیڑ

میں اس نے زندہ رہنے کا چیلنج قبول کیا تو بڑی بہادری سے زندگی کی مشکلات سے جنگ کی مسٹر قریشی شہر چھوڑ گیا مگر وہ اسی شہر میں رہی جہاں نہ اس کا کوئی عزیز تھا نہ رشتہ والا تھا اور پھر فن اس کی زندگی کا محور بن گیا تھا وہ مصوری اور مجسمہ سازی کی تعلیم دینے لگی مصوروں اور مجسمہ سازوں سے فنی لڑائیاں شروع کر دیں اور کبھی ہار نہ مانی وہ جس بات کو درست سمجھتی تھی اس پر ڈٹ جاتی تھی کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھی منہ پھٹ ایسی کہ جس کی چاہے اتار کر ہاتھ میں پکڑا دے اور وہ میرے سامنے کرسی میں ڈھیر پڑی تھی میں نے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا اسے خوش کرنے کا یہ آزمودہ نسخہ تھا گانا پسند ہوتا اسے غصہ ناراضگی یاد نہیں رہا کرتے تھے اور وہ تھرکنا شروع کر دیا کرتی گانا بجتا رہا اور وہ خاموش کرسی میں پڑی رہی بالکل نڈھال میں نے معذرت کی کہ میں نے تو اسے تنگ کرنے کو کہا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور ریت کی بوری بنی پڑی رہی تھی

بیل چل پڑے تھے پانی کی دھار پھر سے رواں دواں ہو گئی تھی سورج کا زاویہ نگاہ بدل گیا تھا سائے اپنا اپنا مقام بدل رہے تھے اور وہ میرے سامنے ہری گھاس پر بیٹھی تھی وہ جو سایوں کے جگہ بدل لینے سے بہت پریشان رہتی تھی اور زندگی بھر جگہ بدلتے سائے کینوس پر مقید کرنے کی جدوجہد کرتی رہی تھی اور جگہ بدلتے سائے اور بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں بھی اسے بیدار نہیں کر رہی تھیں شاید وہ میرے جواب کی منتظر تھی

''مسٹر بخاری آپ کو انکار نہیں کریں گے میں جانتی ہوں وہ صرف آپ کی بات مانتے ہیں آپ کہیں تو وہ مان جائیں گے میں تین چار نشستوں میں ہیڈ پورٹریٹ مکمل کر لوں گی آپ مجھ پر ایک اور احسان کریں'' اس نے میری خوشامد شروع کر دی ''میں کئی بار کہہ چکی ہوں مگر بخاری مانتا ہی نہیں وہ میری بات نہیں مانے گا میں اس کی فطرت سے واقف ہوں''

مسٹر بخاری مسز قریشی کے لئے پوز کیوں نہیں کرتے؟ میں سوچنے لگا لوگ تو اس کے فن کا نشانہ بننے کے لئے بے چین رہتے ہیں مگر وہ کسی کو لفٹ نہیں کراتی پیسوں کے ڈھیر کو ٹھوکر مار دیتی ہے، پلے سے پیسے دے کر ماڈل حاصل کرتی ہے ''میں کسی فن نا آشنا پر اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتی یہ فن کی توہین ہے'' اور مسٹر بخاری کو لازوال بنانے کے لئے وہ دیوانی ہوئی جاتی ہے آخر کیوں؟

اگلی چھٹی کے دن میں اسے کنویں پر لے جانے کے لئے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھی ملازم نے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چٹ تھمادی ''میں ہسپتال جارہی ہوں کمرہ نمبر گیارہ میں آجائیں''

''مسز قریشی ٹھیک تو ہیں''

''کوئی نئی بیماری تو نہیں پرانے والی ہی ہیں سب'' ملازم نے جواب دیا

وہ مجھے ہسپتال کے دروازے پر ہی مل گئی ایک ہاتھ میں گلدستہ اور دوسرے میں لاٹھی وہ اپنے بھاری جسم کو لاٹھی کے سہارے گھسیٹتی چلی جارہی تھی اس کے گھٹنوں میں اتنا شدید درد ہوتا تھا کہ شاگرد اسے گاڑی میں بھی سہارا دے کر بٹھاتے تھے اسے معلوم تھا کہ میں آنے والا ہوں مگر اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور گھٹنوں کو لاٹھی کے زور پر چلنے پر مجبور کررہی ہیں

''مسز قریشی خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا

''مسٹر بخاری بیمار ہیں ان کی خیریت معلوم کرنے آئی ہوں''

مجھے مسٹر بخاری کی بیماری سے زیادہ مسز قریشی کے بارے میں تشویش تھی میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا

بخاری کا سالخوردہ جسم بے حس تھا چہرے کی رنگت سے اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا مسز قریشی نے گلدستہ سرہانے رکھ دیا مسٹر بخاری نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا مسز قریشی نے اس کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس طرح چوما جیسے ماں بچے کو چومتی ہے مسٹر بخاری نے اس کی اس حرکت پر ایک بار پھر آنکھیں کھولیں اور بند کرلیں، وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور بازو دبانے لگی میں ایک طرف کھڑا دیکھتا رہا اس نے ڈاکٹروں کے نسخے پڑھے نرس کو بلایا چارٹ دیکھ کر علاج کے بارے میں اس انداز میں تفتیش کی جیسے نرس سے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہو سیب کاٹ کر مسٹر بخاری کو پیش کیا تو اس نے سیب کی چند پھانکیں لیں اور تشکر کے انداز میں مسز قریشی کی طرف دیکھا

کمرے سے باہر آئے تو وہ بہت خوش تھی سر کو جھٹکا دے کر اپنے کٹے ہوئے بال درست کئے ایک طرف کو کھسکی ہوئی چادر چھاتیوں پر پھیلائی اور لاٹھی کھڑکھڑاتی ہوئی چل دی جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھا

مسٹر بخاری جتنے روز ہسپتال میں رہے وہ باقاعدگی سے انہیں دیکھنے جاتی رہی ہر روز گلدستہ لے جاتی اس کا بازو دباتی اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتی مسٹر بخاری بھی مسکرا کر اس کا استقبال کرتے تھے وہ ہر کام ہمیشہ وقت پر کرنے کی عادی تھی کسی کی پینٹنگ شروع کرتی تو

وعدے سے ایک دو روز پہلے مکمل کرلیتی تھی اور مسٹر بخاری کی بیمارداری میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ فوج کے لئے جو وہ پینٹنگ بنارہی تھی اسے دینے کی تاریخ قریب آرہی ہے ایک دو دفعہ میں نے اسے یاد بھی دلایا مگر اس نے پھر بھی کوئی دھیان نہ دیا۔ میرے لئے اتنی تبدیلی ہی کافی تھی کہ ایک روز اس نے حکم دیا کہ میں اس کے اپنے بیڈروم کی تصویر اتروا کر مسٹر بخاری کے گھر پہنچادوں۔ ''وہ ہسپتال سے فارغ ہوکر آگئے ہیں میں خود یہ تصویر ان کے بیڈروم میں لگاؤں گی''

ایک روز میں نے اسے بتایا کہ کنویں کے اردگرد جنگل میں ڈاکو اور اشتہاری مجرم چھپے رہتے ہیں وہ رات کو شہروں میں ڈاکے ڈالتے ہیں اور دن کو لوگوں کو پکڑ کر ان کا سامان چھین لیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی ''میں ان سے ملنا چاہتی ہوں آپ ملاسکتے ہیں مجھے ان سے؟'' آسمانوں کا مسافر اونچے درختوں کی چوٹیوں سے نیچے اتر کر جنگل میں چھپنے جا رہا تھا آسمان کے کناروں سے شفق کی سرخی کی برسات سے سرکنڈے کی چوٹیاں سرخ ہورہی تھیں دن بھر کی دانہ دنکا گردی کے بعد کوے فوج در فوج جنگل پر حملہ آور ہورہے تھے میں چاہتا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے ہم جنگل سے نکل جائیں مگر وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے خوش ہو رہی تھی۔ ''شاید وہ آپ سے پورٹریٹ بنوانا پسند نہ کریں''

''میں تو انہیں کمیشن کرنا چاہتی ہوں''

''میرا پورٹریٹ بنوانے کے لئے''

وہ ہنس پڑی ''میں ان سے کچھ حرامیوں کو ختم کروانا چاہتی ہوں''

''آپ نے ان حرامیوں کی کوئی فہرست تیار کررکھی ہے؟''

''وہ فہرست میں نے یہاں لکھی ہوئی ہے'' اس نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے کہا ''اس نیک کام کے عوض میں ان تمام ڈاکوؤں کے مجسمے بنانے کو تیار ہوں''

کوؤں کی ایک اور فوج نغمے الاپتی ہوئی ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی اس نے کینوس پر رنگ تھوپتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا ''اگر آپ کے واقف ہوں تو میرا ان سے ٹھیکہ کرا دیں، نقد معاوضہ دوں گی''

ایک صبح وہ اپنی میز پر مسٹر بخاری کی ڈیڑھ درجن تصاویر پھیلائے انہیں مختلف زاویوں سے تول رہی تھی مجھے دیکھتے ہی مسکرائی ''اگر واقعی آپ مسٹر بخاری کے ہمدرد ہیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے لے آئیں ورنہ میں تصویر دیکھ کر اس کا ہیڈ پورٹریٹ بنا دوں گی شکل بگڑ گئی تو مجھے الزام نہ دینا'' اس کے انداز میں عزم تھا

''مجھے آپ دونوں سے ہمدردی ہے بڑھاپا سب کا محفوظ رہنا چاہیے''

اس نے میری بات نہیں سمجھی یا شاید وہ سمجھنے کے موڈ میں ہی نہیں تھی ''مٹی گارا تیار ہے، پلاسٹر آف پیرس ادھر پڑا ہوا ہے میں مزید انتظار نہیں کر سکتی کیا معلوم کب مر جاؤں''۔ کچھ عرصہ سے وہ بھی مسٹر بخاری کی طرح موت کو کثرت سے یاد کرنے لگی تھی

کیا اس لئے تو وہ مسٹر بخاری کا پورٹریٹ بنانا نہیں چاہتی کہ محبت کی نشانی رہ جائے اس کا عزم دیکھ کر میں نے سوچا لیکن کیا مسٹر بخاری مان بھی جائیں گے؟

وہ کرسی سے اٹھی اور سٹینڈ پر سے کسی چیز کا نقاب الٹ دیا ''یہ دیکھو''

ہیڈ پورٹریٹ کا سانچہ کافی حد تک مکمل ہو چکا تھا مگر اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ ہے کس ملک کا بندہ مٹی کا سر بھی عشق کے ابتدائی مراحل میں تھا۔

''دیکھ لیا پھر نہ کہنا'' اس نے سانچے پر کپڑا ڈالتے ہوئے کہا اور مٹی کو نرم رکھنے کے لئے کپڑے پر پانی ڈالنے لگی۔

''ارے ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ اس سردی میں سر پر پانی؟ ابھی چند روز پہلے ہی وہ ہسپتال سے آیا ہے بے چارہ''

''اتنی سردی سے مسٹر بخاری نہیں مر سکتا وہ بہت سخت جان ہے'' اس نے قہقہہ لگایا اور ایک تصویر اٹھا کر مجھے دکھائی ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

تصویر میں مسٹر بخاری اس انداز میں مسکرا رہے تھے جس میں کم از کم میں نے انہیں کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا ''اتنی تصویروں میں سے آپ نے یہی کیوں منتخب کی ہے؟''

''مجھے اچھی لگتی ہے اور کیوں اگر تم اسے لا کر میرے سامنے نہیں بٹھاؤ گے تو پورٹریٹ ایسا ہی بناؤں گی پھر نہ کہنا'' اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور سٹینڈ پر رکھے مٹی کے مجسمے پر پولی تھین لپیٹتے ہوئے کہا ''اب اسے سردی نہیں لگے گی آپ فکر نہ کریں''

''اب بتاؤ کیا ارادہ ہے'' اس کا انداز فاتحانہ تھا ''مٹی تخلیق کا مادہ ہے'' وہ کرسی میں دھنس کر مجھے سمجھانے لگی ''اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے تخلیق کیا تھا میں مٹی سے انسان کا صرف ڈھانچہ تیار کرتی ہوں پورٹریٹ پلاسٹر آف پیرس سے تیار کرتی ہوں'' وہ بول رہی تھی اور میں

کہیں دور نکل گیا تھا مسٹر بخاری کو اس کے تنگ و تاریک سٹوڈیو میں آنے پر کیسے آمادہ کیا جائے؟ گھنٹوں مسز قریشی کے سامنے گم صم بیٹھنے پر کیسے تیار کیا جائے؟ ٹھیک ہے وہ ملک کی سب سے بڑی مصور ہے مگر مسٹر بخاری بھی تو سب سے بڑا بیوروکریٹ رہا ہے

پھر جب مسٹر بخاری مان گئے تو مجھے اور بھی حیرانی ہوئی ''اندر سے یہ بھی گئے'' فن یا پورٹریٹ سے انہیں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی میں نے اتنا بتایا کہ مسز قریشی نے ان کا ہیڈ پورٹریٹ شروع کر دیا ہے اور وہ اسے اپنی گیلری میں رکھیں گی اور اگر وہ پوز کرنے نہ گئے تو آئندہ نسلوں کو ان کا وہی پورٹریٹ دیکھنا پڑے گا جو وہ اپنی مرضی اور تصویروں کی مدد سے تیار کریں گی تو مسٹر بخاری نے شیروانی منگوائی ناک نقشہ ٹھیک کیا اور چپکے سے چل دیئے

سٹوڈیو کے دروازے پر وہ ایک دوسرے کو اس تپاک سے ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوں مسٹر بخاری مسز قریشی کی تعریف کر رہے تھے مسز قریشی مسٹر بخاری کی خوشامد میں مصروف تھی پھر جب بھی مسٹر بخاری پوز کرنے آتے مسز قریشی دروازے پر ان کا استقبال کرتی مسٹر بخاری ان کے سامنے سارا وقت مسکرانے کی کوشش میں رہتے اور مسز قریشی مٹی میں اس کے چہرے کے نقوش مقید کرتے ہوئے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی ہوتی اور ایک ملازم ہمہ وقت دست بستہ حاضر رہتا چائے کافی سگریٹ حاضر کرنے کو

جیسے جیسے ہیڈ پورٹریٹ مکمل ہو رہا تھا مسز قریشی کا رویہ بھی تبدیل ہو رہا تھا کبھی وہ اچانک سنجیدہ ہو جاتی تھی اور دور کھڑے ہو کر پورٹریٹ اور مسٹر بخاری کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتی تھی اور گردن کو جھٹکا دے کر پھر سے مسکرا مسکرا کر باتیں شروع کر دیا کرتی تھی اس کا ہاتھ مٹی پر اس تیزی سے چلتا جیسے مسٹر بخاری کو دیکھ کر ان کے جسم میں زندگی کی نئی رو دوڑ جاتی ہو مسٹر بخاری کو مسز قریشی کے رویہ میں تبدیلی کا اندازہ نہیں تھا وہ ہر روز بن ٹھن کر پوز کرنے آتے رہے اور میں بھی کچھ سمجھ نہ سکا۔

اور آخری روز جو کچھ ہوا میں کبھی اس کا گمان بھی نہیں کر سکا تھا دونوں بوڑھا بوڑھی آمنے سامنے بیٹھتے ہی ماضی کی یادوں کے خزانے کھول دیا کرتے تھے مسز قریشی مسٹر بخاری کے سنہری کارناموں کا ذکر کرتی ایسی باتیں کرتی تھی جنہیں ہر کوئی سن کر خوش ہوتا ہے مگر اس آخری روز اس نے اچانک رخ تبدیل کر لیا تلخ موضوع چھیڑ دیئے ایسی باتیں کرنے لگی جو مسٹر بخاری برداشت نہیں کر سکتے تھے مسز قریشی ایک کے بعد دوسرا تلخ موضوع چھیڑتی جا رہی تھی اور مسٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بخاری کا موڈ خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا اور مسز قریشی کے چہرے پر خوشیاں ناچنے لگی تھیں ڈیڑھ گھنٹہ کی نشست کے خاتمہ پر اس نے جھک کر شکریہ کہا تو مسٹر بخاری جواب میں شکریہ بھی نہ کہہ سکے ہونٹ سختی سے دبائے وہ سیدھے گاڑی کی طرف دوڑے ڈرائیور پیچھے رہ گیا اور وہ آگے نکل گئے زندگی میں شاید پہلی بار مسٹر بخاری نے کار کا دروازہ خود کھولا اور جھٹ سے گاڑی میں چھپ گیا مسز قریشی سٹوڈیو کے دروازے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جب مسٹر بخاری کی گاڑی نظروں کی حدود سے نکل گئی تو اس نے سٹوڈیو کا دروازہ بند کر لیا اور کرسی میں دھنس کر قہقہے لگانے لگی

میں پریشانی میں ہیڈ پورٹریٹ کو اور کبھی مسز قریشی کو دیکھتا رہا جب وہ خوشی کے دورہ سے واپس آئی تو مجھے حیران کھڑا دیکھ کر شکریہ ادا کیا ''اب میں خوشی سے مرنے کے لئے تیار ہوں''

وہ خلاف معمول گاڑی تک میرے ساتھ آئی وہ بار بار شکریہ ادا کر رہی تھی

اس صدمے سے میں کئی روز نڈھال رہا مسٹر بخاری کو کیا منہ دکھاؤں مسز قریشی کی شکل دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں گا؟

ایک صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ''آج ضرور آئیں بڑا ضروری کام ہے''

دل تو نہیں چاہتا تھا مگر مسز قریشی کا حکم تھا

بیٹھتے ہی ملازم نے میرے سامنے چائے رکھ دی میں خاموش تھا مسٹر بخاری سے اس کے سلوک کی نہ میں نے بات کی نہ خود مسز قریشی نے کوئی اشارہ دیا میں محسوس کر رہا تھا کہ آج وہ بہت خوش ہے مجھے اس کی یہ خوشی اچھی نہیں لگ رہی تھی پھر وہ مجھے اپنی گیلری میں لے گئی تین ہیڈ پورٹریٹ ایک لائن میں رکھے تھے آخر میں مسٹر بخاری کا ہیڈ پورٹریٹ تھا چھوٹی چھوٹی آنکھیں، اندر کو دھنسے ہوئے گال، باہر کو نکلی ہوئی چہرے کی ہڈیاں، خوفناک مسکراہٹ۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''مسز قریشی یہ آپ نے کیا کیا؟'' میں چیخ پڑا

وہ مسکرائی '' کچھ بھی نہیں کیا صرف مسٹر بخاری کی اصل شکل آپ کو دکھائی ہے''

''یہ تو مسٹر بخاری کا نہیں شیطان کا ہیڈ پورٹریٹ ہے'' میں پورٹریٹ توڑنے کے لئے آگے بڑھا

وہ میرے اور ہیڈ پورٹریٹ کے درمیان کھڑی ہو گئی ''یہ وہ شیطان ہے جو مسٹر بخاری کے خوبصورت چہرے کے پیچھے چھپا ہوا ہے اور ہمیشہ سے وہیں رہا ہے میں نے اسے

بے نقاب کر دیا ہے تا کہ لوگ اسے پہچان سکیں اور آئندہ نسلیں اس کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں''۔

''مسز قریشی مجھے افسوس۔۔۔۔۔''

میرے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی ''یہ مسٹر قریشی کا سب سے بڑا دشمن تھا میں نے اس کا بدلہ لیا ہے'' پھر اس نے دیگر دو مجسموں کی طرف اشارہ کیا ''یہ بھی مسٹر قریشی کے دشمن تھے یہ تین شیطان ہیں میں نے تینوں سے بدلہ لے لیا ہے''۔

میں سر جھکائے گیلری سے باہر نکل آیا

وہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی پیچھے آ رہی تھی ''آپ کی مدد کے بغیر میں اس شیطان سے بدلہ نہیں لے سکتی تھی میں آپ کی بہت بہت شکر گزار ہوں''۔

اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی مانند کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امانت

جب بھی ساون برستا ہے ہم دونوں بھائی اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی ڈالنے جاتے ہیں تو ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سال کے باقی گیلے اور سوکھے مہینے ہم اس جھگڑے پر مٹی ڈالنے میں لگے رہتے ہیں مگر جیسے ہی نیا ساون برسنا شروع ہوتا ہے نئے پانی کے دھارے پرانا جھگڑا بہالے جاتے ہیں اور ایک نیا جھگڑا پیچھے چھوڑ جاتے ہیں

ہم جس گاؤں میں رہتے ہیں وہاں کوئی قبرستان نہیں ہوتا تھا ہم سے پہلے جو لوگ اس گاؤں میں رہا کرتے تھے وہ آگ اور راکھ والے تھے انہیں نہ قبر کی ضرورت ہوتی تھی نہ کسی قبرستان کی جب وہ چلے گئے اور ہم اس گاؤں میں آباد ہو چکے تو قبرستان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہونے لگی موت زندگی کے بغیر اور زندگی قبرستان کے بغیر نہیں چل سکتی گاؤں کے مغرب میں اونچے ٹیلے پر کسی رفتہ تہذیب کا ایک وسیع قبرستان نامعلوم صدیوں سے نئی آبادی اور آبادکاری کی خواہشات دل میں چھپائے ویران پڑا تھا زندگی اور موت نے مل کر اس کی آبادکاری کا منصوبہ بنایا تو بہت کامیاب رہا تھوڑے ہی سالوں میں ٹیلے کی اونچائی پر مزید آبادکاری کی گنجائش نہ رہی تو اس کی ڈھلوانوں اور نشیبوں پر بھی قبریں اُگ آئیں جب بھی ساون برستا ہے ٹیلے کی اونچائی سے آنے والے پانی کے دھارے اس کی ڈھلوانوں پر بنی قبروں سے ٹکراتے ہیں تو ان پر نئی مٹی ڈالنا لازم ہو جاتا ہے ہم دونوں بھائی اپنے ماں باپ کی قبروں پر نئی مٹی ڈالنے جاتے ہیں اور ایک نیا جھگڑا لے کر واپس آتے ہیں

ہمارے ماں باپ کی قبروں کے پاس ایک تیسری قبر ہے اور جھگڑا ہمیشہ اسی قبر کے

بارے میں ہوتا ہے وہ قبر بھی ہم نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی اس کی لحد میں جسے اتارا گیا تھا اس کا جنازہ بھی ہمارے ہی گھر سے اٹھایا گیا تھا ہم دونوں بھائیوں نے اس قبر کی مٹی ہموار کر کے اس پر اپنے آنسوؤں سے چھڑکاؤ کیا تھا اور دعا سے فارغ ہوتے ہی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ وہ قبر ہے کس کی؟ اور جھگڑا یہ بھی ہے کہ اس تیسری قبر پر فاتحہ پڑھنا ثواب ہے یا گناہ؟ فرض ہے یا جرم؟ جب ہم اس گاؤں میں آئے تھے تو میری عمر کوئی زیادہ نہیں ہوتی تھی اور جو گاؤں ہم چھوڑ کر آئے تھے میری اس کی یادیں بھی کافی کم سن تھیں میری یادوں کی ساری فصل اسی نئے گاؤں میں اگ کر جوان ہوئی ہے میری خوشیوں اور غموں کی دولت سب کچھ مجھے اس نئے گاؤں نے دیا ہے اس تیسری قبر کے لئے جگہ بھی اسی گاؤں نے دی تھی مگر ہمارے جھگڑے سے ہمارا یہ گاؤں بھی ٹیلے پر بنے قبرستان کی مانند غیر جانبدار رہتا ہے

ہم پرانے گاؤں سے بالکل خالی ہاتھ آئے تھے صرف ہماری والدہ کے پاس پیارالی کی یادوں کا کوئی خزانہ تھا جسے وہ معلوم نہیں کیسے بچا کر ساتھ لے آئی تھیں وہ ہم دونوں بھائیوں کو اور اپنے اس خزانے کو چھپا چھپا کر رکھا کرتی تھیں اور اپنے سے جدا نہیں کیا کرتی تھیں اور ہم دونوں کو اپنی آنکھوں سے دور نہیں جانے دیتی تھیں شاید اس لئے کہ نئے گھر میں ہم چار ہی تو جی تھے میں تھا میرا بھائی تھا ہمارا باپ تھا اور ہماری والدہ تھیں

پھر جب ہماری اور ہماری طرح گاؤں کے دوسرے نئے باسیوں کی عارضی مستقل آبادکاری کا پروگرام شروع ہوا تو ہمارے والد کو ایک ایکڑ فی فرد کے حساب چار ایکڑ زمین الاٹ کر دی گئی تھی جن خاندانوں کے افراد زیادہ تھے ان کے حصہ میں زیادہ زمینیں آئی تھیں اور جن خاندانوں کے افراد پرانے گاؤں سے نئے گاؤں کے سفر میں شہید ہو گئے تھے دریا میں بہہ گئے تھے یا گم ہو گئے تھے وہ بھی ہمارے والد کی طرح خسارے میں رہے تھے اور جن خاندانوں کے جتنے زیادہ افراد بچ کر آ گئے تھے وہ اتنے ہی زیادہ فائدے میں رہے تھے

ہمارے والد کو ہل چلانا اور فصل اگانا نہیں آتا تھا اس لئے وہ اور بھی گھاٹے میں رہے تھے ہمارے دادا جی کو بھی ہل چلانا اور فصلیں اگانا نہیں آتا تھا مگر وہ اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ نئے گاؤں کے سفر کے دوران شہید کر دیئے گئے تھے اور اس خسارے سے بچ گئے تھے اور سارے گھاٹے اور سارے مسئلے ہمارے والد کے لئے وراثت میں چھوڑ گئے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید میرا باپ مجھے بھی ہل چلانا اور فصل اگانا نہیں سکھانا چاہتا تھا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نئے گاؤں میں میرا کوئی مناسب مصرف نہ ہو یا پھر اسے اپنے خسارے کا احساس ہو پتہ نہیں کیوں میرے والد نے مجھے سکول میں داخل کرا دیا تھا ہمارے گاؤں سے اور بھی بہت سے لڑکے سکول جایا کرتے تھے اور ہم سب کے سر اور پاؤں ننگے ہوتے تھے اور ہم سب بہت خوش ہوتے تھے اور خوشی خوشی سکول جایا کرتے تھے اور ہماری یادوں کی نئی فصل ہمارے اس نئے گاؤں کے کھیتوں اور سکول کے میدانوں میں بڑی تیزی سے پرورش پانے لگی تھی اور مجھے اپنی والدہ کے یادوں کے اس خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی جسے وہ فرصت کے لمحات میں گھر کے کسی کونے میں کھول کر بیٹھ جایا کرتی تھیں اور اس کے موتیوں کی چمک سے ان کی آنکھوں میں پانی چمکنا شروع ہو جایا کرتا تھا

ایک دن میں سکول سے واپس آیا تو ہماری والدہ کی آنکھوں سے ساون برس رہا تھا میں دیکھتا رہا اور ساون برستا رہا اس روز مجھے دیکھ کر میری ماں نے اپنی آنکھیں نہیں پونچھی تھیں اور جب اس نے گھڑونچی پر رکھے گھڑے میں سے مٹی کے پیالے میں میرے لئے ٹھنڈا پانی ڈالا تھا تو اس کی آنکھوں کی برسات سے پیالے کا ٹھنڈا پانی ابلنے لگا تھا اور میں وہ ابلتا ہوا پانی پی کر دوسرے کونے میں دبک گیا تھا اور اس سہ پہر میں اپنے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے بھی نہیں گیا تھا اور اس رات کے کھانے پر ہمارے والد بھی بہت خاموش سے رہے تھے مگر وہ ہم دونوں بھائیوں کو اپنی خاموشی میں شامل نہیں کیا کرتے تھے اور وہ رات بھی مجھے داؤد کے پتن کی رات جیسی لمبی اور گیلی محسوس ہوئی تھی اور اگلے روز سکول میں کمرے کی چھت بھی مجھے ٹپکتی ہوئی دکھتی رہی تھی

پھر ہماری والدہ کی آنکھوں کے اس ساون بھادوں سے ہمارے لئے خوشیوں کی نئی کونپلیں نکل آئی تھیں چند روز بعد ہمارے والد کہیں سے ہمارے لئے ایک خالہ ڈھونڈ لائے تھے اور ہماری والدہ نے گھر کے کونوں میں سردے کر یادوں کا خزانہ پھر ولنا بند کر دیا تھا اب وہ ہر وقت ہماری خالہ کے ساتھ چپکے چپکے باتوں میں مصروف رہنے لگی تھیں وہ دونوں ہانڈی روٹی بھی مل کر کرتی تھیں ایک آدھ کپڑا ابھی دونوں مل کر دھوتی تھیں اور صاف ستھرے گھر کو پھر سے صاف ستھرا بھی مل کر کیا کرتی تھیں

ہماری اس خالہ کی عمر بھی کوئی زیادہ نہیں تھی بس کوئی بارہ چودہ سال ہی ہوگی اور کبھی

کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بھی ان پریوں میں سے ایک ہیں جن کی کہانیاں وہ ہمیں رات کو سنایا کرتی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ اسی لئے تو ہماری والدہ کبھی انہیں اکیلی نہیں چھوڑتیں کہ وہ کہیں اپنے دیس نہ اڑ جائیں کبھی شبہ ہوتا کہ ہماری والدہ نے ہماری خالہ پری کو کسی جادو ٹونے سے کیل رکھا ہے اور اس ٹونے کا سحر ٹوٹ جانے کے ڈر سے وہ انہیں اپنی آنکھوں سے دور نہیں جانے دیتیں

خالہ رات کو ہمارے والے کمرے میں ہی سوتی تھیں اور ہر روز ہمیں ایک نئی کہانی سنایا کرتی تھیں جب ہم دونوں بھائی سو جاتے تھے تو وہ مصلے پر کھڑی ہو جایا کرتی تھیں وہ سوتی کب تھیں سوتی بھی تھیں یا نہیں ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا ہم کہانیوں اور پریوں کے بارے میں ہی سوچتے سوچتے پریوں کے دیس میں گھومتے پھرتے سو جایا کرتے تھے اور وہ مصلے پر کھڑی ہو جاتی تھیں پھر ایک رات ایسا ہوا کہ میری نیند کھل گئی مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری چارپائی کے قریب کوئی اونچی آواز میں چلا رہا ہے ''پینچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی! پینچوں کی کہانی تو ختم ہو گئی!'' میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا خالہ گھبرا گئیں وہ ابھی تک مصلے پر ہی بیٹھی تھیں اور ''پینچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی'' کا ورد کر رہی تھیں ''میں تمہارے لئے نئی کہانی سوچ رہی تھی'' انہوں نے گھبراہٹ میں کہا اور مصلہ لپیٹنے لگیں

ہم کئی روز تک پینچوں کی وہ نئی کہانی سننے کی ضد کرتے رہے اور خالہ آنے بہانے سے ہمیں ٹالتی رہیں کبھی کہتیں ''تمہارے جاگ جانے سے میں تو وہ کہانی پوری بن ہی نہیں سکی تھی'' کبھی کہتیں ''میں سوئی تو کہانی بھول گئی تھی بنت ابھی کچی جو تھی''

''آج تو ہم پینچوں کی کہانی ہی سنیں گے'' ایک شب ہم دونوں بھائیوں نے مشترکہ فیصلہ سنا دیا

''کیوں تنگ کر رہے ہو اپنی خالہ کو'' ہماری والدہ آواز سن کر ہماری طرف آ گئیں

''خالہ پینچوں کی کہانی نہیں سناتیں انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں پینچوں کی کہانی سنائیں گی''

ہماری والدہ نے بڑی عجیب سی نظروں سے خالہ پری کی طرف دیکھا تو انہوں نے نظریں جھکا لیں اور پھر وہ دونوں چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئیں اور ہم انتظار کرتے کرتے سو گئے

''کل آپا نے مجھے بہت ڈانٹا تھا اگر اب تم نے ضد کی تو میں اپنی چارپائی دوسرے کمرے میں لے جاؤں گی'' اگلی شب کہانی شروع کرنے سے پہلے خالہ نے دھمکی دے ڈالی اور وعدہ کیا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر میں چوتھی کا وظیفے کا امتحان پاس کرلوں تو وہ ہمیں پنچوں کی کہانی کا تحفہ دیں گی

ان کی دھمکی نے بڑا اثر کیا ہم ان کے پسند کی کہانیاں سننے لگے اور پھر کبھی پنچوں کی کہانی سننے کے لئے ضد نہ کی لیکن اس تحفہ کے لالچ میں چوتھی جماعت کے وظیفہ کے امتحان میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میرا بھائی ہر روز مجھ سے پوچھنے لگا کہ وظیفہ کے امتحان میں کتنے دن باقی رہ گئے؟ وہ امتحان کی تیاری میں تو میری کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا لیکن پنچوں کی کہانی کا تحفہ وہ مجھے ہر روز یاد دلاتا رہتا تھا اور میں وظیفہ اور کہانی کے تحفہ کے لئے اور بھی زیادہ پڑھائی کرنے لگا تھا

ایک دن میں کھیل کر آیا تو ہماری والدہ کپڑے دھو رہی تھیں اور خالہ ان سے ذرا دور چولہے کے سامنے بیٹھی چاول صاف کر رہی تھیں میں نے سوچا پیچھے سے ''ہاؤ!'' کر کے خالہ کو ڈراتا ہوں میں بے آواز قدموں سے چلتا چولہے کی دیوار کے پیچھے چھپتا ہوا خالہ کے قریب پہنچ کر گھبرا گیا ''پنچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی! پنچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی!'' وہ آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ سامنے پرات میں بکھرے چاولوں کو بتا رہی تھیں ان کے دونوں کھلے ہاتھ ان کے دونوں پاؤں پر تھے اور وہ سر ڈالے آہستہ آہستہ ''پنچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی! پنچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی'' کا ورد کر رہی تھیں میں اسی طرح بے آواز قدموں سے دیوار کے پیچھے چھپتا ہوا اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا

اس شام میں نے اپنے بھائی کو اس بارے میں بتایا تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا اور پنچوں کی کہانی سننے کا میرا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا تھا

وقت کے ساتھ ایک طرف ویران ٹبے پر قبروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف ہمارے نئے گاؤں میں زندگی نئے اعتماد کے ساتھ چلنے لگی تھی گاؤں کے بھٹی راجپوتوں کے سکول جانے والے لڑکے جو شروع میں ہم سے الگ الگ رہتے تھے اب وہ بھی ہم میں گھل مل رہے تھے اور یادوں کی فصلوں میں ویرائٹی سی آنے لگی تھی کہ اچانک نئی رونقیں اور نئی ویرانیاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گاؤں میں آن داخل ہوئیں بہت سے ہستے بستے گھر ویران ہو گئے اور بہت سے اداس گھر خوشیوں سے بھر گئے بھٹی راجپوتوں کے زمینوں کے کلیم تصدیق ہو کر نہ آئے تو ان کی عارضی الاٹ منٹ کی زمینیں بھی ڈوگروں کو الاٹ کر دی گئیں بہت سے بھٹی راجپوت شہروں کی طرف چلے گئے جو کہیں نہ جا سکے تھے وہ لوہار اتر کھانا کرنے لگے اور ہمارے بہت سے سکول کے ساتھی بچھڑ گئے بہت سے کتابیں چھوڑ کر اپنے اپنے والد کا ہاتھ

بٹانے لگے مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یادوں کی ایک فصل کاٹ لی گئی ہو اور دوسری بوئی جا رہی ہے

ہمارے اپنے گھر میں بھی اب نئی خوشیوں کی آمد شروع ہوگئی تھی ہمارے والد کو کافی زیادہ زمین الاٹ ہوگئی تھی انہوں نے مجھے سکول جانے کے لئے سائیکل خرید دی تھی میرا بڑا بھائی اب گھوڑے پر سوار ہو کر ڈیرے جانے لگا تھا ہمارے والد نے دو تین ملازم بھی رکھ لئے تھے لیکن گھر کا سارا کام اب بھی ہماری والدہ اور خالہ خود ہی کیا کرتی تھیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی وہ دونوں مل کر ہی کرتی تھیں اور جب وہ مل کر کام نہیں کر رہی ہوتی تھیں تو سر جوڑ کر کوئی باتیں کر رہی ہوتی تھیں

پھر ایک شام میں نے خالہ کو پہلی بار روتے دیکھا وہ چیخیں مار رہی تھیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں ''اس نے میرے باپ کی زمینوں کا کلیم کیوں داخل کرایا تھا مجھ سے پوچھے بغیر؟ اسے میری نہیں ان زمینوں کی ضرورت ہے۔''

ہماری والدہ خاموش تھیں اور ہمارا والد سر ڈالے خالہ کے سامنے بیٹھا تھا اور خالہ رو رہی تھیں ''پنچوں کی کہانی تو ختم ہوگئی ہے مجھے ان زمینوں کی کوئی ضرورت نہیں تم مجھے گھر سے نکال دو گے تو میں محنت مزدوری کرلوں گی مگر اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی اسے کہہ دو جا کر'' ہماری والدہ اور والد کو وہیں بیٹھے چھوڑ کر وہ روتی ہوئی اٹھیں اور ہمارے کمرے میں جا کر کنڈی لگا لی۔

میرے بھائی نے بتایا کہ ڈیرے پر ایک بڈھا آیا بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ وہ خالہ کو لینے آیا ہے اور وہ خالہ کا کوئی تایا وایا ہوتا ہے پھر میرا بھائی رونے لگا اور میں بھی رونے لگا تھا اور خالہ نے اس بڈھے سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ جہاں کہیں سے آیا تھا واپس چلے گیا تھا اور ہم دونوں بھائی بہت خوش ہوئے تھے

میں نے چوتھی جماعت کا وظیفے کا امتحان تو پاس کرلیا مگر خالہ کو ان کا پنچوں کی کہانی سنانے کا وعدہ یاد نہ دلایا معلوم نہیں کیوں مجھے اس کہانی کی یاد سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی میں پانچویں جماعت سے چھٹی میں ہوگیا تو بھی خالہ ہمیں ہر رات مصلے پر کھڑے ہونے سے پہلے ایک کہانی سناتی رہیں اب وہ کہانیوں کی پری سے پریوں کی کہانی بنتی جا رہی تھیں اور ہم پنچوں کی کہانی بھولنے لگے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو ایک شام پھر میں نے اپنے والد کو خالہ کے سامنے سر ڈالے خاموش بیٹھے دیکھا ایک بار پھر ہماری والدہ رو رہی تھیں ''کون اٹھا کر نکالے گا اس گھر سے میری ڈولی؟ آپا تمہاری ڈولی تو تمہارے چار بھائیوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا کر تمہارے باپ کے گھر سے نکالی تھی میرا تو یہ ایک ہی بھائی ہے تم دے سکتی ہو مجھے میرے تین بھائی؟ لا سکتی ہو انہیں واپس؟ یہ میرا بھائی تو اکیلا رہ گیا ہے کیسے نکالے گا یہ اکیلا میری ڈولی اس گھر سے'' خالہ میرے والد کے سامنے ایسے بول رہی تھیں جیسے کبھی کسی کو ان کے سامنے بولنے کی جرات نہیں ہوئی تھی اور میرا والد پھر بھی سر ڈالے خاموش بیٹھا تھا جیسے وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں بیٹھا تھا

''مگر۔۔۔''

''آپا کچھ مگر وگر نہیں اب مجھے صرف ایک ہی چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے کفن پیچوں کی کہانی تو ختم ہو چکی ہے'' خالہ نے ہماری والدہ کی بات کاٹ دی۔

اور وہ دونوں رونے لگیں

والد کے بعد جب ہم اپنی والدہ کو کفن پہنا کر اس ویران ٹبے پر آباد نئی بستی میں چھوڑنے لے چلے تو خالہ نے دعا اور درخواست کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ کندھوں سے اوپر تک اٹھا کر کہا ''تم بھی چھوڑ گئیں! کیوں؟ میرا کیا قصور تھا؟ میں آ رہی ہوں تمہارے پیچھے میں پوچھوں گی لانے والے اور لے جانے والے سے''

اور پھر ایک روز خالہ نے ہم دونوں بھائیوں کو قریب بلایا ''ایک تھا گاؤں اور ایک تھا اس گاؤں کا پیچ بہت غصے والا اور بڑے رعب والا تھا وہ پیچ جب کبھی اسے بہت زیادہ غصہ آتا تھا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنا شروع ہو جاتے تھے ''یہاں سکھ بم ماریں گے مشرق کے لوگ مغرب کو دوڑیں گے مغرب کے لوگ مشرق کو دوڑیں گے یہاں مسلمانوں کا بیج نہیں رہے گا'' وہ اپنی حویلی کے کسی مکان کی چھت پر چڑھ کر اس گاؤں والوں کو خبردار کیا کرتا تھا اور گاؤں والے اپنے پیچ کے ڈر سے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں پر ہنس بھی نہیں سکتے تھے اس پر وہ اور بھی زیادہ طیش میں آ جایا کرتا تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنا شروع ہو جاتے تھے

پھر جب رسولپور پر سکھوں نے حملہ کیا تو پیچ کو بہت ہی غصہ آیا ''تمہیں جرات کیسے ہوئی عبدالقادر کے گاؤں کی طرف رخ کرنے کی؟'' وہ گالیاں دیتا ہوا حملہ آوروں کی طرف دوڑا

تین چار گولیاں بیک وقت اس کے سینے سے پار ہو گئیں اور اس کا جسم اور غصہ ٹھنڈے ہو گئے

لڑائی دوپہر کو شروع ہوئی اور رات گئے تک جاری رہی حملہ آور گولیاں چلاتے رہے بم مارتے رہے اور رسولپور والے لاٹھیوں برچھیوں اور نیزوں سے ان کا مقابلہ کرتے رہے گاؤں کی گلیاں اور کنویں لاشوں سے بھر گئے

پھر حملہ آور گنے کے کھیتوں میں چھپتے ہوئے حویلیوں کی پچھلی طرف سے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے ان کے پاس بم تھے، بندوقیں تھیں اور پٹرول سے بھرے ہوئے کنستر تھے وہ بندوقیں چلا رہے تھے بم مار رہے تھے مکانوں کی چھتوں میں سوراخ کر کے پٹرول چھڑک رہے تھے آگ لگا رہے تھے نعرے لگا رہے تھے اور بھاگتے پھر رہے تھے اور ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو اپنے اپنے گھروں میں بند کر کے کنڈیاں لگا لی تھیں اور گلیوں میں حویلیوں میں گھروں کے صحنوں میں لڑائی ہو رہی تھی مکان جل رہے تھے اور جلتے ہوئے مکانوں کے اندر بچے پانی پانی چلا رہے تھے اور مائیں انہیں خاموش رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ہر طرف نعرے بلند ہو رہے تھے

عبدالقادر پیچ کی بیوی اپنے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کو اپنے جلتے ہوئے مکان میں چھپائے بیٹھی تھی مکان جل رہا تھا اور اس کے معصوم بچے پانی پانی چلا رہے تھے اور باہر گولیاں چل رہی تھیں نعرے بلند ہو رہے تھے اور ماں نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی اور بچوں کو سینے سے لگایا ہوا تھا

بہن سے بھائیوں کی چیخیں نہیں سنی جا رہی تھیں اس نے کنڈی کھولی صحن میں لاشیں بکھری ہوئی تھیں پانی کے سب گھڑے خالی تھے اور وہ لاشوں اور زخمیوں کے درمیان دوڑی پھر رہی تھی اور پانی کا کہیں ایک قطرہ نہیں تھا اور مکان جل رہا تھا اور اندر اس کے بہن بھائی پانی پانی چلا رہے تھے

جب وہ قریب کے کسی گھر سے پانی لے کر واپس آئی تو وہاں پانی مانگنے والا کوئی نہیں تھا جلتے ہوئے مکان کی چھت اس کی ماں اس کے معصوم بھائیوں اور بہن کے اوپر گر گئی تھی شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے اور چاروں طرف سے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں اور حملہ آور ''مسلی! مسلی!'' چلانے لگے تھے اور وہ دوڑتی ہوئی لاشوں کے ایک ڈھیر میں چھپ گئی تھی اور جب اگلی صبح سورج شب رفتہ کی نامکمل کہانی کا انجام دیکھنے کے لئے آنکھیں ملتا ہوا بیدار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا تھا تو رسولپور کے بچے کھچے لوگ گلیوں اور حویلیوں میں اپنے اپنے گھروں کی راکھ میں لاشوں کے ڈھیروں میں سے کسی بچ جانے والے کو تلاش کرتے پھر رہے تھے اور جس کسی کو جو کوئی بھی بچہ مل جاتا تھا وہ اسے اپنا ہی سمجھ کر سینے سے لگا لیتا تھا اور سورج سے رسولپور کی کہانی کا اختتامیہ دیکھا نہیں گیا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر سیاہ پوش گھٹائیں روتی ہوئیں ماتم کرتی ہوئیں آ گئی تھیں..

عبدالقادر پینچ کا رشتہ کا ایک بھائی راکھ اور لاشوں کے ڈھیروں میں اپنے کسی بچے کو ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ گیا اور اس کی بیٹی کو گلے سے لگا کر اس سے ان کے بارے میں پوچھنے لگا جن کا راکھ کے پاس بھی کوئی پتہ نشانی نہ تھے پھر وہ اپنے ایک ٹانگ والے بیٹے کو اٹھا کر اور عبدالقادر کی بیٹی کو سینے سے لگا کر کسی طرح پاکستان پہنچ گیا تھا

خالہ نے پینچوں کی کہانی سنانے کا اپنا وعدہ پورا کر کے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ہم نے ان کی وصیت کے مطابق بے کی ڈھلوان پر اپنی ماں اور باپ کی قبروں کے پاس ایک اور قبر بنا کر انہیں اس کے سپرد کر دیا تھا اور قبر پر آنسوؤں کا چھڑکاؤ کرنے سے فارغ ہوتے ہی ہم دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور میرے بھائی نے اسے خالہ کی قبر ماننے سے انکار کر دیا تھا ''خالہ کی قبر تو رسولپور میں ہے''

اگلے ساون کے مہینے میں اس تیسری قبر پر مٹی ڈال چکے تو میں نے پوچھا ''پھر ہم نے اس قبر پر مٹی کیوں ڈالی ہے اسے پانی کے دھاروں کے ساتھ بہہ کیوں نہیں جانے دیتے؟''

وہ غصہ میں آ گیا ''یہ ہماری خالہ کا ورثہ ہے جو وہ رسولپور کے پینچوں کی یتیم کہانی کے لئے چھوڑ گئی تھیں اور یتیموں کی وراثت کی حفاظت ہم پر فرض ہے''

اس ساون میں اس قبر پر فاتحہ کے لئے میں نے ہاتھ اٹھائے تو اس نے مجھے روک دیا ''تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی کی وراثت پر فاتحہ پڑھنا گناہ ہے''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا

''پینچوں کی یتیم کہانی کی یہ وراثت ہمارے پاس امانت ہے اور میں تمہیں اس امانت میں خیانت کی اجازت نہیں دے سکتا'' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی

اور ہم ایک بار پھر ایک نیا جھگڑا لے کر گھر کی طرف چل دیئے

ہم دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے ہم دونوں خاموش تھے اور ایک بھائی کی خاموشی دوسرے کی خاموشی سے جھگڑ رہی تھی اور قبرستان غیر جانبدار تھا

رولدو

ایک مدت کے بعد جمی کی آواز سنی تھی ''ارے جمی تم؟'' میں نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا..

''جمی نہیں ملک صاحب رولدو کہو'' اس نے قہقہہ لگایا..

''کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ کہاں رہے؟'' وغیرہ وغیرہ میں نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال پوچھ ڈالے

''موت کا بہت کرم ہے ملک صاحب'' اس نے ایک اور قہقہہ لگایا

''آپ کی آواز ٹھیک نہیں آ رہی''

''اللہ موت کی عمر دراز کرے اس کا آپ کے رولدو پر بہت کرم ہے''

اس کی آواز تو صاف تھی وہ بہت خوش تھا اور میں پریشان ہونے لگا تھا ''موت اور اس کا کرم اور اللہ اس کی عمر دراز کرے یہ جمی کو کیا ہو گیا ہے؟'' مجھے اس کی آواز پر شک ہونے لگا تھا جمی تو ایسا نہیں ہوتا تھا وہ تو ہر بات سر جھکا کر خاموشی سے سنتا تھا اور قہقہہ لگانے کی تو اس میں ہمت ہی نہ ہوا کرتی تھی

''آپ کے ذمہ میرا کچھ قرض ہے آپ ادا کریں گے آج؟''

''قرض؟ کیسا قرض؟'' میں اور بھی پریشان ہو گیا

''اگر آپ اجازت دیں تو میں حاضر ہو کر اس کی تفصیل بتا سکتا ہوں''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں ہاں اجازت کی کیا بات ہے ابھی آ جاؤ''

ریسیور رکھ کر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا جمی کی آواز سن کر مجھے جتنی خوشی ہوئی تھی ''ابھی آ جاؤ'' کہنے سے اتنا ہی گہرا دکھ محسوس ہو رہا تھا یہ قرض اور وہ بھی رولدو کا قرض ہے میرے ذمہ؟ میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اپنے اندر انڈھیلا پر ذرا بھرافاقہ نہ ہوا ٹھنڈے پانی میں کافی کا ڈیڑھ کپ ملا دینے سے محسوس ہوا جیسے میرے اندر سمندر کی گرم اور سرد پانی کی لہروں کے دست و گریباں ہو جانے سے بھاپ کے بادل اٹھنے لگے ہوں اور وہ ساری بھاپ اور سارے بادل میرے دماغ میں جمع ہو رہے ہوں میں نے جمی کا قرض دینا ہے؟ نیم والی کوٹھی والے جمی کا؟ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا مگر تھا تو وہی وہ ساری آواز تو اسی کی تھی پر اس آواز کے پیچھے کون تھا؟ وہ جمی تو قہقہے نہیں لگا سکتا اور یہ موت اور اس کا کرم یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ میں نے ملازم کو کافی کے بعد چائے لانے کو کہا اور جمی کا انتظار کرنے لگا۔

اسمبلی ہال سے گنگا رام ہسپتال کی طرف جائیں تو شاہراہ فاطمہ اور لارنس روڈ کے ملاپ سے آگے بائیں طرف تین چار بڑی بڑی ویران کوٹھیوں کا ایک خاموش جزیرہ ہوتا تھا اور لاہور میں آنے کے بعد میں نے انہی کوٹھیوں میں سے ایک کی ویران برساتی میں پناہ لی تھی وہ سب کوٹھیاں اداس اداس اور خوفزدہ سی ہوتی تھیں اور جس کوٹھی کی برساتی میں نے کرایہ پر لی تھی اس کا مالک مرنے سے چند روز پہلے اپنی قدیم بیوی کو طلاق دے کر نہایت اداس موت مر گیا تھا کوٹھی کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے اس کے بیٹے بیٹیوں نے مل جل کر اس کی شاندار موت کی خبر چھپوائی تھی اور اسے دفن کرنے کے بعد پھر سے لڑنے میں مصروف ہو گئے تھے اور وہ کوٹھی اور بھی اداس ہو گئی تھی ان دنوں اس کوٹھی کے سامنے کے حصہ میں ایک بدصورت سا بیوٹی کلینک ہوتا تھا باقی کوٹھی میں ایک سیاسی جماعت دن کے وقت دفتر لگایا کرتی تھی اور دوپہر ڈھلنے کے ساتھ ہی دفتر اور سیاست کو تالا لگا کر چھٹی کر جایا کرتی تھی اور بیوٹی کلینک میں بھی ایک ہی شفٹ کا بزنس چل سکتا تھا اور میں اور ویرانی اس میں اچھے ہمسایوں کی طرح رہا کرتے تھے کلینک والی کوٹھی کے پیچھے والی کوٹھی پھیلتی پھیلتی جزیرہ کی تین سڑکوں تک چلی گئی تھی یہ کوٹھی ایک ہندو زمیندار کی تھی اور اس کے درختوں مکانوں اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے وسیع جنگل میں سات آٹھ نفس چھپے ہوتے تھے ٹھاکر جی تھے ان کی بیوی تھی اور بیٹا بیٹی تھے ان کے سرونٹ کوارٹروں میں ایک ہندو بیوہ اور اس کے دو جوان بیٹے مقیم ہو گئے تھے ٹھاکر جی کی کوٹھی

کے ساتھ والی کوٹھی کو نیم والی کوٹھی کہتے تھے اور اس کوٹھی سے دن اور رات کے مختلف حصوں میں ''جمی! جمی!'' کی آوازیں آیا کرتی تھیں اور میں صبح اخبارات سے فارغ ہو کر جب ناشتے کی تلاش میں نکلتا تھا تو نیم والی کوٹھی کے گنگا رام ہسپتال کی طرف کے دروازے سے دو آدمی برآمد ہوا کرتے تھے ان میں سے ایک آگے آگے چلتا تھا اور دوسرا بغل میں فائلیں دبائے اور سر جھکائے دس فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے رہتا تھا نیم والی کوٹھی سے نکل کر وہ شاہراہ فاطمہ کی طرف نہیں آتے تھے بلکہ خاموش چلتے ہوئے باغ جناح کی طرف سے گھوم کر لارنس روڈ پر مڑ جایا کرتے تھے اور ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے شاہراہ فاطمہ کو کاٹ کر کیتھڈرل سکول اور چرچ کو بائیں ہاتھ چھوڑتے ہوئے شاہراہ قائداعظم کے ہجوم میں گم ہو جایا کرتے تھے۔

آگے چلنے والے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے شخص کا رنگ کافی گورا تھا اور اردگرد کے سب لوگ اسے گورا صاحب کہا کرتے تھے اس کے بیضوی چہرے پر آگے کو نکلی ہوئی ناک کے دونوں طرف بڑی بڑی آنکھیں بھی اداس اداس سی ہوتی تھیں پچاس پچپن کی عمر اور تھوڑا سا آگے کو نکلا ہوا پیٹ سفید پینٹ سیاہ کوٹ اور کالی ٹائی سڑک پر چلتے ہوئے وہ کبھی ادھر ادھر نہیں دیکھتا تھا سیدھا چلتا تھا اور چلتا ہی جاتا تھا بغل میں فائلیں دبا کر سر جھکا کر اور دس فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہنے والے شخص کی عمر پچیس اٹھائیس برس ہو گی سیاہ رنگ چپٹی ناک اندر کو دھنسے ہوئے گال لاغر لاغر سا اور پتلا پتلا سا اس کا قد پانچ فٹ سے بھی چار پانچ انچ کم ہی ہو گا ٹخنوں سے اوپر تک اٹھی پھٹی پرانی پینٹ اور اسی کا ہم جنس اور ہم عمر کوٹ اور پاؤں میں پشاوری چپل وہ نیم والی کوٹھی کا جمی ہوتا تھا۔

سڑک پر چلتے ہوئے وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی اجنبی رہتے ہوئے سارا راستہ طے کیا کرتے تھے۔

نیم والی کوٹھی کے مکینوں میں دو خواتین بھی تھیں ان میں سے ایک بھاری بھاری اور کالی کالی سی ہوتی تھی اس کی عمر ریٹائرمنٹ کی سرکاری حدود کو بہت پہلے عبور کر چکی تھی وہ دیسی لباس پہنتی تھی ولایتی زبان بولتی تھی اور بوڑھے مالی کو موٹی موٹی گالیاں دیا کرتی تھی دوسری خاتون کی عمر تیس بتیس برس ہو گی اس کا رنگ دیسی اور ولایتی ملا جلا سا تھا دونوں مردوں کے جانے کے بعد جب وہ اونچا منی سکرٹ اور اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر بیوٹی کلینک جانے کو نکلتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی تو کافی اونچی دکھتی تھی جتنا عرصہ گوراصاحب اور جمی گھر سے باہر رہتے وہ سارا وقت وہ بیوٹی کلینک میں گزارتی تھی اور ان کے واپس آنے سے پہلے پہلے اپنے چہرے پر نیا رنگ روغن کروا کر واپس آجایا کرتی تھی

اس کوٹھی کے پچھلے لان میں ٹھاکر جی کی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ نیم کا وہ بہت قدیم درخت ہوتا تھا جس کی وجہ سے اسے نیم والی کوٹھی کہتے تھے گوراصاحب جب گھر پر ہوتا تھا تو اس درخت کے نیچے ایک پرانی سی کرسی میں گھسا اخبار پڑھنے اور اپنے کتوں جیکی اور لاڈو سے سرگوشیاں کرنے میں مصروف رہتا تھا اور بڑی عمر کی خاتون کو دور سے دیکھ کر ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو جاتا تھا اور سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا اور جب تک وہ آس پاس رہتی تھی اسی حالت میں کھڑا رہتا تھا

آبادی کی قلت اور درختوں کی کثرت سے ویرانی کا وہ جزیرہ رات کو خوفناک خاموشی کی زد میں آجاتا تھا لوکل ایڈیشن کے لئے آخری خبر دے کر میں جب واپس آتا تھا تو ٹھاکر جی کی کوٹھی کے شاہراہ فاطمہ کی طرف کے گرے پڑے مکانوں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور خودرو درختوں کے جنگل کی باسی بلیاں اور بلے سڑک پر شب خرامی میں مصروف ملتے تھے اور اگر کسی رات چڑیا گھر کا شیر اور گیدڑ ''جاگتے رہو!'' کی صدا لگانے میں دیر کر دیں تو خاموشی کے وزن سے دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا

اس جزیرہ اور اس کے باسیوں سے سال ڈیڑھ میں میری اتنی ہی جان پہچان ہو سکی تھی اور ہم سب پڑوسی اتنی ہی باہمی جان پہچان پر خوش وخرم چلے آرہے تھے ایک اتوار کی چھٹی کی جوانی ڈھلنے کے مرحلہ میں میرا موڈ کچھ خراب ہو رہا تھا وائی ڈبلیو سی اے کا دھوبی ابھی تک نہیں آیا تھا اس کو میرے بستر کی چادریں بدلنا تھیں اور زیتون کے تیل سے میری ہفتہ وار مالش کرنا تھی ''پاکستان میں فٹ بال کا کھیل اسی سبب سے ترقی نہیں کر سکا جس کھیل کی قومی سطح کا رکن اتنا بے نظم ہو وہ آگے خاک بڑھے گا'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے اخبار اور بھی اچھی طرح آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا

''جی میں نیم والی کوٹھی سے آیا ہوں۔'' ہوا میں بھنبھناہٹ سی ہوئی میں نے آنکھوں پر سے اخبار کا پردہ ہٹایا تو دس فٹ کے فاصلہ پر جمی سر جھکائے کھڑا تھا

''آؤ جمی کیسے آئے ہو؟'' اگر رمضان دھوبی نے میرا موڈ اور فٹ بال کے کھیل کا

معیار خراب نہ کیا ہوتا تو میں ''کیسے آئے ہو؟'' کبھی نہ پوچھتا وہ پڑوسی تھا اور پہلی بار آیا تھا پر میں تو اس کے آنے سے پہلے ہی فٹ بال کے کھیل کے معیار کی زد میں آیا بیٹھا تھا جمی نے نہایت ادب سے اپنا دایاں پاؤں اٹھا کر آگے رکھا اپنے جسم کا تھوڑا سا بوجھ ڈال کر دیکھا کہ پاؤں جم گیا ہے یا نہیں پھر اسی انداز میں اپنا بایاں پاؤں آگے رکھ کر جمایا قدم بڑھاتے اور جماتے جماتے قریب پہنچ کر اس نے اپنی کمر کو زاویہ قائمہ پر جھکایا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی طشتری میری طرف بڑھا دی ''یہ بڑی میم صاحب نے آپ کے لئے بھیجا ہے''

کارڈ پڑھا تو کوئی مسٹر ولیم چاہتے تھے کہ اس رات میں ان کے ہاں ایک ادبی محفل میں شرکت کروں

''مسٹر ولیم کون ہیں؟''

''جی گوراصاحب کا نام ہے یہ''

''کہاں جم رہی ہے محفل؟''

''نیم والی کوٹھی میں حضور'' جمی نے اسی طرح نظریں اور سر جھکائے جواب دیا

مجھے ادب شدب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی مگر پڑوسیوں کے حق حقوق کے احترام میں وعدہ کر لیا

جمی زمین تک جھکا اور شکریہ ادا کر کے سیڑھیاں اتر گیا

ادب کی محفل میں کوئی زیادہ بندے نہیں تھے پڑوسیوں میں سے میں تھا ٹھاکر جی ان کی بیگم اور بیٹی تھے شہر کے کسی ادبی رسالے کے ایک نوجوان مالک مدیر تھے جو اپنے ساتھ آٹھ دس ذرا زیادہ نوجوان ادیب بھی لائے تھے اور گھر والوں میں سے مسٹر ولیم اور دونوں خواتین تھیں اور جمی تھا جو دس فٹ کے فاصلے پر دروازے میں جوتوں کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا مسٹر ولیم کی خواہش کے احترام میں مجھے صدارت کے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگانا پڑی میرے بائیں ٹھاکر جی تھے اور دائیں نیم والی کوٹھی کی کم عمر خاتون باقی سب سامنے نیم دائرہ میں مؤدب بیٹھ گئے کاروائی کا آغاز مسز ولیم کی شاعری کے بارے میں تحقیقی مقالہ سے ہوا ادبی رسالہ کے نوجوان مدیر کا تحقیقی مقالہ پون سوا گھنٹے پر محیط تھا اور اس کے ایک ایک فقرے پر مسٹر ولیم کی آنکھوں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں بڑی عمر کی خاتون فخریہ خوشی سے ہر ایک کی آنکھوں میں جھانکتی رہی اور زیادہ ہی نوجوان ادیب پون سوا گھنٹہ دل کھول کر داد دیتے رہے مسز ولیم کو وارث شاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مقابلے کی پنجابی زبان کی شاعرہ قرار دینے کے مرحلہ میں جب نوجوان مدیر نے مسٹر ولیم کو بتایا کہ وارث شاہ پنجابی زبان کا ولیم شیکسپیئر تھا تو وہ کافی دیر تک تالیاں بجاتا رہا مقالہ ختم ہوا اور مسز ولیم سے اپنا کلام پیش کرنے کی درخواست کی گئی تو میرے دائیں بیٹھی خاتون نے ''اجازت ہے؟'' کہا اور میرے اجازت دینے سے پہلے ہی نظم شروع کر دی نوجوان مدیر اور ان کے ساتھی ادیبوں نے ان کی نظموں اور غزلوں کی بہت زیادہ واہ! واہ! کی

جب چڑیا گھر کے گیڈروں نے مل کر ''جاگتے رہو!'' کی صدا بلند کی تو خوشیوں بھری محفل پوری کر دی گئی میں نے اپنے دل میں چڑیا گھر کے گیڈروں کا شکریہ ادا کیا اور وہ میرے صدارتی کلمات کے دوران بھی مسلسل ''جاگتے رہو! جاگتے رہو!'' کی صدائیں بلند کرتے رہے اور میں نے اپنے پڑوس میں عصر حاضر کی اتنی عظیم شاعرہ کی موجودگی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا پینے کھانے کے دوران بھی داد اور خوشی کا اظہار جاری رہا اور جمی سر جھکائے خاموش ایک کونے میں کھڑا رہا۔

پوہ کی سرد رات میں کہر کے بادلوں نے خاموشی کے پورے جزیرے کو آغوش میں لے لیا تھا اور گیڈروں کے بعد چڑیا گھر کا شیر بھی ''جاگتے رہو!'' کی صدا بلند کر کے کب کا سو چکا تھا بڑی والی خاتون نے حکم دیا تو جمی خاموشی سے سر جھکا کر میرے ساتھ چل دیا وہ دس فٹ کا فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا شاہراہ فاطمہ میں داخل ہوئے تو پیچھے سے آواز آئی۔ ''آپ کو معلوم ہے بڑی میم صاحب میری سسٹر ہیں''

میں نے مڑ کر دیکھا تو جمی کی آنکھوں میں سو وولٹ کے بلب روشن تھے

''اور مسز ولیم؟''

''وہی تو بڑی میم صاحب ہیں وہ دوسری والی تو والدہ ہیں میم صاحب کی اور میری''

پھر مسز ولیم کی ادبی سرگرمیاں نیم والی کوٹھی سے نکل کر شہر کے مختلف ادیبوں کے گھروں تک پھیل گئیں جمی ہر اتوار کو ہفتہ بھر کی ان کی سرگرمیوں کی رپورٹ دینے آتا تو سابقہ رپورٹ کی اشاعت پر مسٹر ولیم کا شکریہ بھی پہنچا جایا کرتا تھا اور رمضان دھوبی اسے دیکھتے ہی ''آ گیا میرا رولدو'' کا نعرہ لگایا کرتا تھا اور اسے تنگ کرنے کو گورا صاحب کے قدیم عشق و عاشقی کے قصے شروع کر دیا کرتا تھا اور جمی احتجاجاً واک آؤٹ کر جایا کرتا تھا

رمضان دھوبی کا وائی ڈبلیو سی اے اور ارد گرد کی کوٹھیوں کے لڑائی جھگڑوں اور عشق

معاشقوں کی تاریخ کا علم کافی وسیع اور باریک ہوتا تھا گورا صاحب کو وہ اس وقت سے جانتا تھا جب انہوں نے کسی غریب مہاجر سے کوڑیوں کے بھاؤ کلیم خرید کر نیم والی کوٹھی اپنے نام پکی کروائی تھی کلینک والی کوٹھی کے مالک کے کوٹھی پر قبضہ کرنے اپنی بیوی کو طلاق دینے اور پھر کسی گاؤں میں جا کر چپکے سے مر جانے تک اسے سب کچھ معلوم تھا اور جمی رمضان کے تاریخ کے اس طوفان کی لہروں پر سوکھے تنکے کی مانند ڈبکیاں لینے لگتا تھا ''رولدو گورا صاحب سے درخواست کرو اب ہی وہ تمہیں تمہارا باپ واپس کر دے'' ایک روز رمضان نے قہقہہ لگایا تو جمی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا ''گورا صاحب بہت عظیم ہیں انہوں نے ہمیں حیوان سے انسان بنایا ہے''

رمضان نے قہقہہ لگایا ''رولدو یہ بھی تمہیں گورا صاحب نے ہی بتایا ہو گا کہ تم انسان بن گئے ہو؟''

ایک شب نیم والی کوٹھی میں انگریزی میں زبردست مشاعرہ ہوا رات گئے میں دفتر سے واپس آیا تو اس کوٹھی کے سب باسی جاگ رہے تھے اور جمی کے سوا سارے بلند آوازوں میں انگریزی بول رہے تھے اور سب سے اونچی آواز جمی کی ماں کی تھی اور وہ بار بار کسی موتی کی شان میں کچھ کہہ رہی تھی اور نیم والی کوٹھی میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا چڑیا گھر کے گیڈروں کو پسند نہیں آیا تھا اور وہ کافی دیر تک ''جاگتے رہو! جاگتے رہو!'' چلاتے رہے تھے

اس اتوار کو جمی آیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں

''میری ماں بہت ظالم عورت ہے اس نے گورا صاحب پر بہت ظلم کیا تھا اس رات اور میں ساری رات روتا رہا تھا گورا صاحب نے ہمارے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے سب گورے ولایت چلے گئے سب نے کہا چلو واپس چلو گورا صاحب نے کہا میں اپنے خاندان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا گورا صاحب میری سسٹر سے بہت پیار کرتے ہیں وہ میرے کو بھی بہت پیار کرتے ہیں اور میری ماں ان پر بہت ظلم کرتی ہے وہ بہت ظالم عورت ہے''

ادبی رسالہ کا نوجوان مالک مدیر جس دفتر میں جونیئر کلرک ہوتا تھا گورا صاحب اس کے بڑے افسر ہوتے تھے گورا صاحب نے مدیر کو ترقی دی تھی اور کسی ہندو کا چھوڑا ہوا گھر اس کو الاٹ کرا دیا تھا اور اسے مسز ولیم اور ان کی شاعری کے فروغ پر لگا دیا تھا اور ادبی محفلوں کے اور ادبی رسالہ کے اور مقالے پڑھنے اور سننے والے ادیبوں کے اخراجات گورا صاحب ادا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے تھے اور ادبی رسالہ کے اس مدیر نے نیم والی کوٹھی اور گورا صاحب کے خلاف ٹھاکر جی سے مل کر سازش کی تھی اور ٹھاکر جی کی صاحبزادی کی رونمائی کے لئے اپنے مجلّہ میں مضمون چھاپے تھے اور شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ان کے لئے تعارفی تقریب برپا کی تھی اور ٹھاکر جی کی بیٹی کے شعری مرتبہ کے بارے میں ایک لمبا مضمون پڑھا تھا اور مسز ولیم کی ماں اس وجہ سے گورا صاحب سے بہت لڑی تھی کہ تم اپنے لئے کتے خریدتے ہو تو کئی پشتوں تک ان کا شجرہ نسب دیکھتے ہو کہ اس کا باپ کون تھا اور دادا کیسا تھا کتا نسلی خریدتے ہو اور مدیر بدنسل پالتے رہے ہو جو کھاتا ہمارا ہے اور گاتا دوسروں کا ہے تم نے اس کے باپ کا پتہ کیوں نہ کیا؟

''وہ موتی کون ہے؟''

رولدو نے روتے روتے قہقہہ لگایا ''اماں بہت غصہ میں تھی''

یہ سب کہانیاں پرانی ہو چکی تھیں اور اقبال ٹاؤن منتقل ہو جانے کے بعد سے میری جمی سے نہ کبھی ملاقات ہوئی تھی نہ کبھی بات ہوئی تھی اور ٹیلیفون پر اس کی آواز سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور اس کی باتوں سے میں بہت پریشان ہو گیا تھا جمی آ رہا تھا اور میں ٹھنڈا پانی اور گرم کافی پی پی کر اپنا موڈ درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا میرا دماغ کبھی کھولنا شروع ہو جاتا تھا اور کبھی مفلوج ہو کر رہ جاتا تھا

جمی بڑا ہشاش بشاش تھا میں نے قرض کی بات کی تو اس نے قہقہہ لگایا ''میرے گھر چائے پینا آپ کے ذمہ میرا پرانا قرض ہے''

مسجد شہداء کے پاس سے گاڑی لارنس روڈ میں داخل ہوئی تو جمی نے خوشی سے دونوں بازو لہرائے ''تمہاری یہ مسجد اور ہمارا وہ گرجا موت کی دین ہیں اگر موت نہ ہوتی تو دنیا میں نہ کوئی مسجد ہوتی نہ گرجا ہوتا نہ مندر ہوتا اور نہ ہی بت خانہ ہوتا یہ سب رونقیں موت کی وجہ سے ہیں''

ڈرائیور نے گاڑی وائی ڈبلیو سی اے کی طرف موڑی تو بائیں طرف کی بدصورت نئی عمارتیں سامنے آن کھڑی ہوئیں مجھے وہ بلیاں اور بلے بہت یاد آئے جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے اس جنگل سے نکل کر اندھیری راتوں میں میرا استقبال کیا کرتے تھے ''اگر ٹھاکر جی زندہ ہوتے تو آج بھی یہاں جنگل ہی ہوتا یہ ساری عمارتیں موت نے بنائی ہیں'' جمی ایک بار پھر چلایا

بوڑھے چوکیدار نے بتایا کہ وائی ڈبلیو سی اے کی کسی سدا بہار رہائشی دوشیزہ نے کسی لاولد امیر کبیر بوڑھے سے شادی کر لی ہے اور وہ رمضان دھوبی کو بھی اپنے ساتھ اس کی کوٹھی میں لے گئی ہے تو جمی نے آہنی گیٹ کو زور سے ٹھڈا مارا ''کتے کے بچے رمضانی نے تو موت کا سارا مزہ ہی خراب کر دیا ہے''

چوکیدار نے اپنی بوڑھی آنکھوں کا زاویہ درست کرتے ہوئے پوچھا ''آپ جمی تو نہیں وہ نیم والی کوٹھی والے جمی؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''ہاں ہاں میں وہی ہوں نیم والی کوٹھی والا جمی جسے اب گورا صاحب کے کتے مسٹر جیمز کہہ کر پیار کرتے ہیں وہ رمضانی ملے تو اسے بھی بتا دینا اور ہاں اپنی اس بوڑھی ہیڈ مسٹریس کو بھی جو ابھی تک اپنے سوکھے بازو زندگی کے گلے میں ڈال کر ذلیل و خوار ہو رہی ہے''

چوکیدار نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور سر جھکا لیا

''کتے کا بچہ رمضانی اپنی اس ماں کے نئے خصم کے انڈر ویئر دھونے اس کے ساتھ چلا گیا ہے اللہ نے چاہا تو اب اس بزرگ کی بھی خیر خیریت نہیں رہے گی'' جمی نے ڈرائیور کو گاڑی کی مہاریں نیم والی کوٹھی کی طرف موڑنے کا حکم دے کر رمضان دھوبی کے پرانے قرض چکانے کی کوشش کی

نیم والی کوٹھی کا بیرونی گیٹ بند تھا جمی نے موٹے تالے کی طرف اشارہ کیا ''وہ تالا دیکھ رہے ہیں آپ یہ ہے جسے لوگ زندگی کہتے ہیں یہ ہے زندگی اور اس کی بدصورتی کا نشان موت کا حسن مسجد اور گرجا تو آپ دیکھ چکے ہیں زندگی کو بھی پہچان لیں''

کوٹھی کے باسی کہاں گئے؟ وہ خود کہاں رہتا ہے؟ ٹھاکر جی کے بچے کیسے ہوتے ہیں؟ میرے ذہن میں بہت سے سوال تھے مگر وہ کوئی سوال پوچھنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا ''ٹھاکر مر گیا اور بے چارے مزارعوں کو اس کے ظلم سے نجات مل گئی ٹھاکر کی بیٹی کی بھی عید ہو گئی اس کے مرنے سے وہ سرگودھا والی زمینیں اور کوٹھی سب کچھ بیچ باچ کر دولت کی گٹھڑیاں باندھ کر بمبئی چلی گئی اور وہاں جا کر اعلان کیا ''مجھے پاکستان میں ڈر لگتا تھا'' وہ پاکستان سے ڈرتی رہی اور موتی اس کی شاعری کے بارے میں مضمون لکھ لکھ کر اپنے رسالے میں چھاپتا رہا اور پھر اس کے پیچھے بمبئی گیا ادبی خدمت کا معاوضہ وصول کرنے ادب اور انسانی قدروں کی سربلندی کا خرچہ لینے گیا تھا وہ موتی بمبئی اور موت سے اس کی کمینگی دیکھی نہ گئی اس نے وہیں رکھ لیا اسے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھا کر یہاں مر گیا تھا موتی وہاں جا کر مر گیا حساب برابر ہو گیا''۔

''جمی کسی کی موت پر۔۔۔۔''

''موت نے بہت کرم کیا ہے موتی پر موت نے اسے ذلت کی زندگی سے نجات دلا دی ہے وہ ذلت کو ہی زندگی سمجھ رہا تھا مگر شاید اس بے چارے کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا اس میں ذلت کو زندگی سمجھنا تو اسے باپ دادا سے وراثت ملی تھی اور وہ اس خاندانی وراثت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا ''ماں پر دھی پتا پر گھوڑا'' مگر لوگ تو کہتے ہیں گھوڑا وفادار ہوتا ہے عزت والا معاف کرنا میں غلط کہہ گیا ہوں مجھے ماں پر دھی پتا پر موتی کہنا چاہئے تھا''

''نیم والی کوٹھی میں اب کوئی نہیں رہتا؟'' میں نے موضوع بدلنا چاہا

''مجھے نہیں پتا کہ کوئی رہتا ہے اس کوٹھی میں یا نہیں میں یہ بتا سکتا ہوں کہ ہم اب اس کوٹھی میں نہیں رہتے گورا صاحب گورا قبرستان میں رہتے ہیں ان کی وراثت سے آدھی رقم مجھے جیکی اور لاڈو کو مل گئی تھی ہم تینوں شادماں میں ہوتے ہیں''

''بڑی میم صاحب اور آپ کی والدہ؟''

''اماں اپنے پرانے محلہ میں ہیں ان کے حصہ میں بھی کافی پیسہ آیا تھا گورا صاحب کی وراثت سے وہاں ان کی گالیاں سننے والے کچھ پرانے رشتہ دار ابھی زندہ ہیں بڑی میم صاحب ولایت چلے گئی تھیں وہیں ہوتی ہیں''

''گورا صاحب کے کسی رشتہ والے کی وجہ سے؟''

''گورا صاحب کے رشتہ والے کی وجہ سے نہیں گورا صاحب کے پیسہ کی وجہ سے موت نے ہم سب پر بڑا کرم کیا ہے''۔

وہ مسلسل بولتا رہا اور میں خاموش بیٹھا سنتا اور سوچتا رہا جمی کی مانند لاہور کا وہ حصہ بھی کافی بدل گیا تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین سال گزارے تھے جمی نے بتایا کہ چڑیا گھر کے شیر اور گیدڑوں کی جاگتے رہو کی صدائیں آنا بہت پہلے سے بند ہو چکی ہیں زندگی اور کاروں کے شور میں دب گئی ہوں گی میرے لئے سب سے حیران کن تبدیلی یہ تھی کہ جمی اب بولنے لگا تھا اور مسلسل بول رہا تھا اور مجھے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دے رہا تھا اور اب دس فٹ کا فاصلہ رکھ کر ''حاضر ہو جاؤں'' کی درخواست کرنے والا جمی میرے گوڈے سے گوڈا اور کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھا تھا اور چمکدار پھولوں والی وردی اور پی کیپ قسم کی ٹوپی والا اس کا ڈرائیور

اس کے لئے بھاگ کر دروازہ کھولتا تھا چانا چوک سے گھوم کر ڈرائیور شادماں میں داخل ہو گیا تھا اور جمی مسلسل بول رہا تھا

گاڑی کی آنکھ کے کسی خوابیدہ اشارے سے کوٹھی کا بھاری گیٹ خود بخود وا ہو گیا ڈرائیو کے آخری سرے پر جیکی اور لاڈو سینہ تانے کھڑے تھے ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا جمی نے باہر قدم رکھتے ہی جیکی اور لاڈو کو سہ پہر کا سلام کہا مگر وہ خاموش سینہ تانے کھڑے دیکھتے رہے نہ دم ہلائی اور نہ پاؤں کی مٹی چھوڑی جمی نے ایک ایک کا نام لے کر آوازیں دیں مگر انہوں نے سنی ان سنی کر دیں جمی آگے بڑھ کر باتیں کرنے لگا وہ سینہ تانے سنتے رہے ڈرائنگ روم کی سامنے کی دیوار پر مسٹر ولیم کا رنگ دار پورٹریٹ لٹک رہا تھا اور جیکی اور لاڈو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے اور جمی کی کسی بات پر توجہ نہیں دے رہے تھے اس نے ملازم کو آواز دی اور وہ کتوں کو باہر لے گیا۔

جمی کچھ دیر خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر مسٹر ولیم کے پورٹریٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے سر جھکا دیا واپس صوفے پر آیا تو وہ کافی افسردہ دکھائی دینے لگا تھا ''جب تک گورا صاحب زندہ رہے میں ان کی خدمت کرتا رہا اب جب تک میں خود زندہ رہوں گا مجھے گورا صاحب کے کتوں کی خدمت کرنا ہو گی یہ ہے میرا مقدر اس مقدر کے بنانے میں میرا اپنا کوئی حصہ نہیں اور یہ مقدر اب مجھے چھوڑ نہیں سکتا ڈرائنگ روم میں میرے باپ کی کوئی تصویر نہیں لگ سکتی اس کوٹھی کے کسی اور کمرے میں بھی اس کی کوئی تصویر نہیں میرا باپ ہسپتال میں معمولی ملازم تھا اور معمولی ملازم کی تصویر اپنے ڈرائنگ روم میں کسی کمرے یا گھر میں لگاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے میری ماں اس ہسپتال میں نرس ہوتی تھی گورا صاحب نے میرے باپ سے کہا تم گندی بستی میں رہتے ہو گندے لوگوں کے ساتھ رہتے ہو تمہارے بچے گندے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں تم میری کوٹھی میں آ جاؤ میں تمہارے بچوں کو چھری کانٹے سے کھانے کے آداب سکھاؤں گا وہ پڑھ کر اچھے لوگ بن جائیں گے مگر میرا باپ نہ مانا پھر ایک دن میری ماں ہم دونوں بہن بھائی کو گورا صاحب کی کوٹھی لے آئی اور ہمارا باپ کہیں چلا گیا اور ہم سب اسے بھول گئے اور ہنسی خوشی گورا صاحب کی کوٹھی میں رہنے لگے اور میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانے کے آداب سیکھنے لگے ہماری ماں بہت خوش تھی ہم گورا صاحب کا خاندان بن گئے تھے اور گورا صاحب ہمارا بہت خیال رکھتے تھے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے میری بہن کو مسز ولیم بنا لیا تھا پھر جب گورا صاحب مر گیا تو میری ماں اپنی برادری میں واپس چلی گئی اور میری بہن ہمیں چھوڑ کر ولایت چلی گئی وہ کہتی تھی کہ میں کالے لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی وہ گورے لوگوں میں رہنے چلی گئی ماں اپنی برادری میں چلی گئی۔ ولایت والے گورے میری بہن سے نفرت کرتے ہیں برادری میری ماں سے نفرت کرتی ہے اور ہم سب اپنی برادری سے نفرت کرتے ہیں کہ انہیں چھری کانٹے سے کھانے کا طریقہ نہیں آتا اور وہ گوری تہذیب بھی نہیں جانتے گورا صاحب نے ہمیں چھری کانٹے سے کھانا سکھا کر اور اپنی تہذیب سکھا کر برباد کر دیا ہے اب ہم نہ اپنی بستی میں اپنے لوگوں کے درمیان رہ سکتے ہیں اور نہ آپس میں اکٹھے رہ سکتے ہیں اور میں گورا صاحب کے کتوں کو اپنے ماں باپ سے زیادہ مہذب سمجھتا ہوں اور ان کتوں کے خوف کی وجہ سے اپنے گھر میں اپنے باپ کی تصویر بھی نہیں لگا سکتا میں چاہتا تھا رمضانی مل جائے اور میرے سامنے بیٹھ کر اس حرامزادے گورا صاحب کو اتنی گالیاں دے کر اس کا بھی قرض ادا ہو جائے میں خود تو اس کے کتوں کے ڈر سے اسے گالی بھی نہیں دے سکتا''۔

جمی ایک بار پھر سے مسٹر ولیم کے پورٹریٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا ایک بار پھر اسے سلام کیا اور پھر پورٹریٹ کے منہ پر تھوک دیا''گورا صاحب میں نے تیری خدمت کی اور تو مجھے اپنے کتوں کا غلام بنا کر چھوڑ گیا؟ حرامزادے تو نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا نہ اپنے باپ کا اور نہ اپنی برادری کا گورا صاحب میں ہوا میں معلق ہوں میرے پاؤں قالین پر ہیں مگر زمین پر نہیں تو نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے''اس نے جیب سے رومال نکالا گورا صاحب کے پورٹریٹ کا منہ صاف کیا اور میرے سامنے قالین پر بیٹھ گیا''ملک صاحب مجھے معاف کر دیں آپ نے ہمیشہ مجھ سے پیار کیا ہے اور گورا صاحب نے میرے ذمہ اپنے کتوں کو پیار کرنے کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے یہ میرا مقدر ہے جس کے بنانے میں میرا کوئی حصہ نہیں رمضان ٹھیک کہتا تھا میں جمی نہیں میں وہی ہوں رولدو جس کی قسمت میں ساری عمر گورا صاحب کے کتوں کی خدمت لکھ دی گئی ہے''۔

جمی بول رہا تھا اور گورا صاحب کے پورٹریٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی

☆☆☆☆☆

گوپی کی موت

گوپی کی جانکنی کے لمحات نے میرے دل میں گھونسلا بنا لیا ہے جب بھی کسی رات کی اتھاہ گہرائی میں کہیں بانسری کی آواز گونجتی ہے گوپی اس گھونسلے سے نکل آتا ہے میری انگلی پکڑ کر گاؤں کا چکر لگاتا ہے اور میرے سامنے بیٹھ کر ایک بار پھر مر جاتا ہے گوپی کو اپنی موت پر روتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی مگر اب جب بھی وہ میرے دل کے گھونسلے سے برآمد ہوتا ہے تو میں کئی کئی راتیں بے چین رہتا ہوں

میں اور گوپی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے ہم دونوں کے بچپن بھی ایک ہی گاؤں میں کھو گئے تھے مگر میں نے کبھی گوپی کو پسند نہیں کیا تھا نہ بچپن میں اور نہ ہی لڑکپن اور جوانی میں اور اب وہ میرے بڑھاپے کی راتوں میں اور میرے دل کے گھونسلے میں مجھے بے چین رکھتا ہے

ہمارا گاؤں گھنے جنگل بیلے میں چھپا رہتا تھا راوی کے ڈھائے پر جہاں اوتاڑ کا جنگل ہتاڑ کے بیلے سے گلے ملتا تھا یا شاید جدا ہوتا تھا وہاں پر پرانے وقتوں میں ہمارے اجداد نے وہ گاؤں بسایا تھا اور راوی صدیوں سے اس کا احترام کرتا آ رہا تھا راوی ہر سال اردگرد سے کئی گاؤں چاٹ جایا کرتا تھا مگر ہمارے گاؤں کے ڈھائے کو چوم کر وہ ہر بار الٹے پاؤں پیچھے ہٹ جاتا تھا گاؤں کے شمال میں ڈھائے کے نیچے سے بیلا شروع ہو جاتا تھا اور میلوں تک پھیلتا چلا گیا تھا ڈھائے کے اوپر گاؤں کے مشرق اور جنوب میں جنگل ہی جنگل ہوتا تھا اور اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنگل کے جنڈ، کریر، ملے اور سرکنڈے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملا کر گاؤں کی حفاظت کیا کرتے تھے اگر تکھیہ کے اونچے اونچے نیم کے بوڑھے درخت نشانی نہ بتاتے تو جنگل بیلے کے اندر سے کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ادھر کوئی گاؤں بھی چھپا ہوا ہے گاؤں کے مغرب کی طرف کے جنگل میں کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی مغل شاہی اینٹوں سے بنائے کسی قدیم زمانے کے کچھ کنویں ہوتے تھے جن کے پاس کاشت کے لئے تھوڑی تھوڑی سی زمینیں تھیں باقی ہر طرف جنگل اور بیلا ہی ہوتے تھے گاؤں کے بیشتر مرد اپنا بیشتر وقت تکھیہ میں گزارتے تھے جہاں نیم کے بزرگ درختوں کے نیچے بڑے بڑے پلنگ پڑے ہوتے تھے اور چٹائیاں بچھی رہتی تھیں گرم دنوں میں گاؤں کے بزرگ پلنگوں اور چارپائیوں پر لیٹے حقہ پیتے تھے اور گاؤں کی نئی نسل کو ان پرانے وقتوں کے قصے سنایا کرتے تھے جب جنگل اور بیلے میں شیر اور بھیڑیئے بھی ہوتے تھے اور ان کے بزرگ مل جل کر ان شیروں کا شکار کیا کرتے تھے اور شیر بیلے میں چرنے والے مویشی کھا پی جایا کرتے تھے مگر ہمارے بچپن میں جنگل بیلے اور گاؤں کے تکھیہ میں شیروں اور بھیڑیوں کی صرف کہانیاں ہی پائی جاتی تھیں شیر اور بھیڑیئے وہ کہانیاں پیچھے چھوڑ کر خود کہیں چلے گئے تھے اور ہمارے بزرگ ان کی جدائی میں کبھی کبھی دکھی ہو جایا کرتے تھے

تکھیہ میں ایک طرف کہانیاں سننے سنانے والے جمع ہوتے تھے تو دوسری طرف نوجوان چٹائیوں پر ٹولیوں میں بکھرے تاش کھیلتے ہوتے تھے اور وہیں ذرا ہٹ کر مسجد والے مولوی صاحب سیف الملوک پڑھ پڑھ کر نیکی کی تبلیغ اور تلقین کیا کرتے تھے اور گوپی کا باپ ان کہانیوں والوں، تاش والوں اور سیف الملوک والوں کے حقوں کے لئے آگ فراہم کیا کرتا تھا جب کبھی ہمارے بزرگوں نے وہ گاؤں آباد کیا تھا تو گوپی کے اس وقت کے کسی جدامجد کو تکھیہ میں ہر وقت آگ جلتی رکھنے کی ڈیوٹی سونپ دی گئی تھی اس نے تکھیہ کے ایک کونے میں گڑھا کھود کر صدیوں پہلے جو آگ جلائی تھی وہ ہماری جوانی تک جل رہی تھی گوپی کا باپ جنگل سے سوکھی لکڑیاں اور گوبر جمع کیا کرتا تھا اور اس آگ کو زندہ رکھتا تھا اس سے پہلے اس کے باپ کا باپ اور بہت پرانے وقتوں سے ان کے قدیم باپ یہ ڈیوٹی دیتے آرہے تھے اور گاؤں آباد ہونے کے وقت سے ہماری جوانی تک گوپی کے خاندان نے کبھی تکھیہ کے تووں کو بجھنے نہیں دیا تھا

پوہ ماگھ کی سرد راتوں میں گوپی کا باپ تووں پر لکڑیاں ڈالتا رہتا تھا اور آگ تاپنے والے نوجوان کو ٹچکریں کیا کرتا تھا اور صبح کی نماز کے بعد سردی سے ٹھٹھرے نمازی مسجد سے نکل کر تووں کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور مسجد والے مولوی صاحب اپنے دونوں ہاتھ اور پاؤں آگ سے اور بھی قریب کر کے انہیں دوزخ کی آگ سے ڈرایا کرتے تھے اور بوڑھے نمازی تووں میں آگ زندہ رکھنے پر گوپی کے باپ کے لئے جنت کی دعائیں کیا کرتے تھے

مسجد اور تکھیہ ساتھ ساتھ تھے مسجد کا صحن تکھیہ تک پھیلا ہوا تھا اور تکھیہ مسجد کے صحن میں شامل ہو جاتا تھا مسجد نماز کے اوقات میں آباد ہوتی تھی اور تکھیہ ہر وقت آباد رہتا تھا مسجد کی محراب سے آگے ایک کھلا میدان تھا جہاں میں اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا اور کھدو کھونڈی کھیلا کرتا تھا اور گوپی کی عمر کے لڑکے وہاں کبڈی کھیلتے تھے اور ہم سارے ہی مسجد والے مولوی کو اور تکھیہ میں تو واں ڈالنے والے کے بیٹے گوپی کو پسند نہیں کیا کرتے تھے

گوپی اپنے باپ کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لایا کرتا تھا اس کی ماں کو گاؤں والوں کی روٹیاں لگانے کے لئے تندور جلانے کے لئے اور اس کے باپ کو تو واں ڈالنے کے لئے ان کی ضرورت رہتی تھی گوپی جب جنگل میں نہیں ہوتا تھا تو مسجد والے مولوی سے کچھ پڑھتا رہتا تھا اور اس کا باپ اسے بانسری بجانا اور مسجد والا مولوی سیف الملوک گانا سکھایا کرتا تھا تکھیہ والے بزرگ اور مسجد والا مولوی گوپی کو ہم سب لڑکوں سے زیادہ پسند کرتے تھے اور اس سے زیادہ پیار کرتے تھے کیونکہ وہ ہمارے ساتھ گلی ڈنڈا نہیں کھیلا کرتا تھا اسی لئے وہ ہمیں پسند نہیں ہوا کرتا تھا

ہمارے گاؤں میں پڑھنے پڑھانے اور بچوں کو تعلیم دلانے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تھی سال بھر کی روٹیوں کے لئے چھوٹی چھوٹی مغل شاہی اینٹوں سے بنے پرانے کنوؤں والی زمینوں سے دانے آجاتے تھے مال مویشی بیلے میں چر لیتے تھے جمن مرن اور خطبہ ونماز کی ضروریات مسجد والے مولوی صاحب کے علم وفضل سے پوری ہو جاتی تھیں اور تکھیہ اور تووں کے لوازمات گوپی اور اس کا والد فراہم کر دیتے تھے اس لئے جب میرے والد نے مجھے شہر کے سکول اور بورڈنگ ہاؤس میں جمع کرا دیا تو گاؤں کے بہت سے بزرگوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا مجھے بھی اس ''ظلم'' کی وجہ سے سمجھ نہیں آئی تھی مگر ہمارے ہاں بچے والدین کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرضی اور فیصلے کی وجہ نہیں پوچھا کرتے تھے اور گاؤں کے بزرگ ہمارے والد سے کسی معاملے میں اختلاف نہیں کر سکتے تھے اس لئے کسی نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی پڑھنے کے لئے شہر چلا گیا تھا اور گوپی کو جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کرتے اور مسجد والے مولوی صاحب سے سیف الملوک پڑھتے چھوڑ گیا تھا

پانی نہ رہے تو دریا مر جاتے ہیں اور ان کی قبروں پر ریت اڑنا شروع ہو جاتی ہے بانسری کی آواز بند ہو جائے تو دریاؤں کے بیلے مردہ مردہ سے معلوم ہوتے ہیں بیلے میں مویشیوں کے گلے کی ٹلیاں بجتی رہیں بانسری کی آواز گونجتی رہے تو بیلا جیتا جاگتا رہتا ہے اور بیلے کو زندہ رکھنے کے لئے چرواہے ہمارے بیلے میں ہیر اور سیف الملوک گایا کرتے تھے اور بانسری بجایا کرتے تھے اور مختلف دیہات کے چرواہوں میں بانسری بجانے اور سیف الملوک گانے کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور جو کوئی مقابلہ جیت جاتا تھا بیلے اور اردگرد کے دیہات میں اس کی واہ واہ ہو جاتی تھی اور اس کے گاؤں والے اور اس گاؤں کے چرواہے اس پر مان کرنا شروع کر دیتے تھے میں جب بھی گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیوں میں گاؤں جاتا تھا تو گوپی پر مجھے اور بھی زیادہ غصہ آنا شروع ہو جاتا تھا اس کی بانسری بیلے میں بھی گونجنے لگی تھی مسجد والے مولوی صاحب تکھیہ میں اس سے سیف الملوک سنتے اور سر دھنتے تھے اور گاؤں کے بزرگ اس سے کچھ زیادہ ہی پیار کرنے لگے تھے

میں شہر میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور گوپی بیلے میں بانسری بجاتا رہا اور تکھیہ میں سیف الملوک گاتا رہا پھر اس کی بانسری کی گونج بیلے سے نکل کر میلے تک پہنچ گئی تو بیلے والے، تکھیہ والے اور مولوی صاحب مسجد والے سب گوپی گوپی کرنے لگے گوپی نے بیلے اور میلے میں ان کے گاؤں کی واہ واہ کرا دی تھی

پھر گوپی کی بانسری میری تعلیم کو پیچھے چھوڑ گئی

اور مجھے اس پر اور بھی زیادہ غصہ آنے لگا

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں راوی کے اوپر کہیں بہت زیادہ بارش ہوئی تھی بیلا جل تھل ہو رہا تھا سیلابی لہروں نے چاندنی کی چادر اوڑھی ہوئی تھی ہوا کی سرسراہٹ لہروں کی نغمگی ایک رات کے پچھلے پہر میں ڈھائے پر گم سم بیٹھا تھا کہ بانسری نے آواز دی اور میرے قدم آواز کی ڈوری سے بندھ گئے تھوڑی دور ڈھائے کے کنارے پر گوپی کھڑا تھا اس کی آنکھیں

بند تھیں اوپر کو اٹھا ہوا اس کا چہرہ چاند کے چہرے سے مل گیا تھا انگلیاں بانسری کے سوراخوں پر ناچ رہی تھیں

اور سیلابی لہریں مستانہ وار جھوم رہی تھیں

اردگرد کے مویشیوں کے باڑوں میں سوئے جوان اور بزرگ اس کے گرد جمع ہوتے رہے اور وہ آنکھیں بند کئے چاند کے چہرے میں چہرہ ملا کر بانسری بجاتا رہا مسجد میں صبح کی اذان ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں مجھے محسوس ہوا جیسے گوپی کی انگلیاں بانسری کے سوراخوں پر نہیں میرے دل پر تھیں جوانوں اور بزرگوں کے دلوں پر ناچتی رہی تھیں بانسری نے لہروں کی روانی اور دلوں کی دھڑکنوں کو گرفت میں لے لیا تھا گوپی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور میں چپکے سے اپنی حویلی کی طرف چل دیا

اگلا سارا دن تکھیہ میں گوپی گوپی ہوتا رہا

ایک بار گاؤں گیا تو تکھیہ بھی اداس ملا اور بیلا بھی گوپی بیلے سے نکل کر میلے گیا تو اس کی بانسری کی آواز شہر والوں نے سن لی تھی گاؤں میں اس کے باپ کے گھر سال میں دو دفعہ ہی دانے آتے تھے اور شہر میں بانسری بجانے کا نقد صلہ مل جاتا تھا اپنے باپ کے گھر میں گوپی نے فصل پکنے پر دانے آتے دیکھے تھے اور شہر کے سکے اس کے لئے شہر کی روشنیوں سے بھی زیادہ چمکدار تھے شہر کی روشنیوں اور پیسوں کی چمک بیلے کی خاموش چاندنی سے زیادہ میٹھی ثابت ہوئی تھی گوپی کی جوانی کے تھنوں میں زندگی کا دودھ پوری طرح بھر آیا تھا اور شہر کی داد میں نازک ہونٹوں کی لالی بھی شامل ہوتی تھی اس کے باپ کے تووں سے اٹھنے والے شعلوں کے پاؤں گڑھے میں جمع راکھ نے پکڑے ہوتے تھے اور گوپی کو شہر کے آزاد شعلوں نے پکڑ لیا تھا سندھ طاس کے معاہدے میں راوی کا پانی بھارت کے حصے میں آ گیا تھا راوی کی لہریں دم توڑ رہی تھیں اور بیلے اور تکھیہ پر اداسی چھانے لگی تھی

سکول سے اور کالج سے ہوتا ہوا میں ایک اخبار میں جا پہنچا تھا اور اخبار کے مالک نے مجھے لوگوں کی خوبیوں، خامیوں اور کمزوریوں کی تتلیاں اور بھڑ پکڑنے کے گر سکھا کر شہر میں کھلا چھوڑ دیا تھا شہر کے اخباروں میں دوسروں کی خوبیوں اور خامیوں سے کھیلنے کا سخت مقابلہ جاری تھا اگر کسی بڑے آدمی کی چھوٹی سی خوبی بھی کسی روز اچھلنے سے رہ جاتی تھی تو صبح نہار منہ جواب طلبی کے ساتھ ایک بار پھر یاد دلایا جاتا تھا کہ میں اپنی کمائی حلال نہیں کر رہا مجھے اپنی حلال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تنخواہ وصول کر کے اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنی خوشی میں اپنے مالک کی مرضی کے لوگوں کی خوبیاں اوران کی نامرضی کے لوگوں کی خامیاں اور کمزوریاں اچھال اچھال کر محسوس کرنے لگا تھا مگر جیسے جیسے خوشی کا یہ دباؤ بڑھ رہا تھا میرا گاؤں جانا بھی کم کم ہوتا جا رہا تھا پھر بھی جب کبھی گاؤں کا چکر لگاتا تھا تو گاؤں کی زندگی بڑی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور زندگی کی تیز رفتاری میں میں نے کبھی گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور مجھے گوپی کے گاؤں چھوڑ جانے کا کبھی افسوس نہیں ہوا تھا

ہمارے علاقہ میں پہلے پہل جو فوجی آئے وہ باوردی تھے اور پیدل چل کر وہاں تک پہنچے تھے وہ راوی کے بیلے میں اور بیلے کے ساتھ ساتھ پاکستانی سرحد کی نگرانی کیا کرتے تھے ان کے بعد باوردی اور بے وردی جرنیل کرنیل سول اور فوجی گاڑیوں میں سوار ہو کر ادھر آنے لگے تو زندگی کی رفتار تیز ہو گئی جرنیل کرنیل پہنچے تو ان کے تعاقب میں کالی سیاہ چمکدار سڑکیں بھی وہاں تک پہنچ گئیں آباد زمینیں کم پڑنے لگیں تو حاضر سروس اور غیر حاضر سروس فوجیوں کو ان کی باوردی خدمات کے بدلہ میں جنگل اور بیلے کی الاٹ منٹ شروع ہو گئی اور جنگل کے صدیوں کے باسی جنڈ کریر اور ملہے بھی گوپی کے پیچھے پیچھے کہیں چلے گئے بیلا کچھ آباد ہو گیا اور جو آباد نہ ہو سکا وہ برباد ہو گیا چرواہے بے وطن ہو گئے اور راوی پانی سے اور بیلا بانسری کی دھنوں سیف الملوک اور ہیر سے محروم ہو گیا پھر جب ٹیوب ویل چالو کرنے کے لئے لوہے کی تاروں میں دوڑتی ہوئی بجلی آئی تو ہمارے گاؤں کے بھاگ بھی روشن ہو گئے چھوٹے چھوٹے افراد اور دیہات کے بھاگ بڑے بڑے لوگوں کے بھاگوں کی دم سے بندھے ہوتے ہیں اوران بڑوں کی دم کی معمولی سی حرکت سے بھی کافی زیادہ جاگ اٹھتے ہیں

گاؤں میں پہلے ریڈیو اور ٹرانسسٹر آئے بجلی آئی تو ناچ رنگ لے کر ٹیلیویژن بھی پہنچ گیا لوگ تکھیہ سے اٹھ کر اپنی اپنی حویلیوں اور گھروں میں جا بیٹھے اور نیم کے بوڑھے درختوں کے نیچے پڑے پلنگ اٹھا دیئے گئے گوپی کا باپ مر گیا تو تکھیہ میں تو واں ڈالنے والا بھی کوئی نہ مل سکا اور صدیوں سے جلتا آنے والا تو واں ہمیشہ کے لئے بجھ گیا آبادی نے پاؤں پھیلائے تو تکھیہ کی خالی زمین پر بھی گھر اور گھروندے بن گئے اور نیم کے بوڑھے درخت کاٹ دیئے گئے گاؤں میں نئی روشنی بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی

میں اور گوپی ایک ہی شہر میں رہتے تھے پر ہماری آپس میں ملاقات کبھی نہیں ہو پاتی

تھی ایک تو شہر ہی بہت بڑا تھا پھر ہم خود بھی تو کچھ بڑے بڑے ہو گئے تھے گوپی تو بہت بڑا فنکار ہو گیا تھا اور ہر دوسرے تیسرے دن صبح اخباروں کی فائل کی پرکھ پڑچول کے دوران اس کی تصویر پر نظر پڑ جاتی تھی مگر اب مجھے اس پر غصہ نہیں آتا تھا میں لوگوں کی خامیاں تلاش کر کے خوش ہو جایا کرتا تھا اور اس مہارت کی بدولت مجھے کسی میں کوئی خوبی نظر نہیں آیا کرتی تھی اپنے اخبار کی پالیسی اور مجبوریوں کے تحت میں کچھ لوگوں کی خوبیاں بھی اچھالتا تھا لیکن کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنا تھوکا ہوا چاٹ رہا ہوں اگر کسی بندے کو ہوا میں معلق کثافتیں نظر آنے لگیں اور وہ دیکھ سکے کہ سانس کے ساتھ کیسے کیسے جراثیم کیڑے مکوڑے اور گند اس کے جسم میں داخل ہو رہا ہے تو وہ کھلی ہوا اور فضا میں سانس لینے سے انکار کر دے گا اخبار نویسی کی کھلی ہوا اور فضا میں میری حالت بھی کچھ ایسی ہی رہنے لگی تھی اور میرے اعصاب پر شہر اور پیشے کی خوشیوں کا دباؤ ناقابل برداشت ہونے لگا تھا میں نے ایک ہفتہ کی طویل چھٹی کی درخواست ایڈیٹر کے پاس جمع کرا دی اور شہری لباس اور مجبوریاں اتار کر گاؤں چلا گیا

ایک دوپہر میں سنہری دھوپ کا کمبل اوڑھے آنکھیں بند کئے حویلی میں چارپائی پر اونگھ رہا تھا کہ باہر سے کسی گاڑی کے قدموں کی آواز آئی ہمارے گاؤں میں گاڑی اب کوئی ایسا عجوبہ نہیں رہی تھی جیسا عجوبہ ایک زمانے میں میری بائیسکل ہوا کرتی تھی اپنی اپنی اور گاؤں والوں کی ضروریات کے تحت اب گاؤں میں کار اور ٹرک والے آتے جاتے رہتے تھے میں دھوپ کے کمبل میں منہ چھپائے اونگھتا رہا لیکن جب ملازم نے بتایا کہ ایک صاحب آئے ہیں اور وہ اپنا نام گوپی بتاتے ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ سکون کی چادر میرے سر کی طرف سے خود بخود لپٹنا شروع ہو گئی ہے اور منہ گردن سینے اور ٹانگوں کے اوپر سے لپٹتی لپٹتی پاؤں کی طرف سے زمین پر جا گری ہے۔

گوپی گاؤں کی ترقی پر بہت خوش ہو رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ خوشی کے اس طوفان کے نیچے کہیں اداسی کی کوئی لہر دبی ہوئی ہے وہ باتیں کرتے کرتے خوشی کا اظہار کرتے کرتے اچانک رک جاتا تھا اور حویلی میں جمع بندوں کو پہچاننے کی کوشش میں لگ جاتا تھا چالیس سال کا عرصہ بیت گیا تھا پرانی نسل کی فصل سنبھالی جا چکی تھی اور نئی نسل اور فصل جوان ہو رہی تھی اور اگر میں گاؤں میں نہ ہوتا تو اسے جاننے پہچاننے والا بھی وہاں مشکل ہی سے کوئی ملتا گاؤں کے بندے اس کی شخصیت اور باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچے کندھوں کے چھوتے اس کے سر کے رنگین بالوں کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے

وہ باتیں کرتا کرتا اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''اجازت دیجئے میں ابھی آتا ہوں ذرا گاؤں گھوم لوں''

گوپی ابھی تک گاؤں کی پرانی روایات نہیں بھولا تھا مجھ سے ''آؤ ذرا گاؤں کا چکر لگائیں'' کہنا ان پرانی روایات کے منافی تھا جن کی اس کے آباؤ اجداد نے اسے تعلیم دی تھی

میں ان روایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیا

حویلی کے سامنے گاؤں کے بچے اس کی پجارو کے گرد جمع تھے اور اس کا ڈرائیور بچوں کو پجارو سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ''نہ ہٹاؤ انہیں کھیلنے دو'' اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی

حویلی سے نکل کر وہ تکھیہ کی طرف نہیں گیا میرا خیال تھا کہ وہ اپنا آبائی گھر دیکھنا چاہتا ہے جو کئی سالوں سے بند پڑا تھا وہ گھر کی بجائے گلی کی طرف مڑ گیا کوئی پاس گزرنے والا اسے تھوڑے سے غور سے دیکھ کر آگے نکل جاتا تو گوپی نگاہیں جھکا لیتا گاؤں کے لوگ گوپی میں اتنی دلچسپی بھی نہیں دکھا رہے تھے جتنی دلچسپی سے گاؤں کے بچے اس کی پجارو دیکھ رہے تھے گلی کے آخری سرے تک جاتے جاتے اس کی رفتار مدھم ہو گئی تھی گلی کے اس سرے پر گوپی کی ماں کا تندور ہوتا تھا گوپی نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دوسری گلی میں مڑ گیا اس گلی سے نکل کر وہ تکھیہ کے رخ چل پڑا ''یہاں تو کچھ بھی نہیں بچا'' اس نے چاروں طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں خاموش تھا اور گوپی مٹی میں ماحول میں اور فضا میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی جو وہ چھوڑ کر بانسری بجاتا ہوا اور سیف الملوک گاتا گاتا شہر چلا گیا تھا نیم کے بوڑھے درخت بڑے بڑے پلنگ حقہ پینے والے اور کہانیاں سنانے والے بزرگ اور اس کے باپ کا تو واں اور سیف الملوک پڑھنے والا مولوی وہاں کچھ بھی نہیں تھا ظہر کی اذان ہو چکی تھی نمازی مسجد کی طرف جا رہے تھے وہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا نمازی گردن گھما کر اس کی اور میری طرف دیکھتے اور آگے نکل جاتے ''یہ ناچا کون ہے؟'' وقت کے مولوی صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اونچی آواز میں کسی سے پوچھا

گوپی نے سر کو جھٹکا دیا مسجد کو ایک نظر دیکھا اور حویلی کی طرف چل دیا اس جگہ پہنچ کر

جہاں اس کے اجداد کے توویں کا گڑھا ہوتا تھا وہ ایک لمحہ کے لئے رکا یادوں کی پھسلن پر اس کے قدم جم نہیں رہے تھے وہ کوئی ایسی ڈوری تلاش کر رہا تھا جو اسے وقت کی سیلابی لہروں کے نیچے اس تکھیہ تک کھینچ لے جائے جہاں وہ سیف الملوک پڑھا کرتا تھا اور مسجد والا مولوی سردھنا کرتا تھا وہ بانسری بجاتا تو بڑے بڑے بے ڈھنگ پلنگوں پر دراز گاؤں کے بزرگوں کی آنکھوں میں چمک آ جایا کرتی تھی اور اس کے باپ کی آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو جاتا تھا اور نوجوان اس کی طرف رشک اور حسد سے دیکھا کرتے تھے پھسلن پر اس کے قدم جم نہیں رہے تھے وہ لمحہ ادھورا چھوڑ کر آگے چل دیا حویلی پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال سا ہو گیا تھا کرسی میں ڈھیر ہوتے ہوئے اس نے سرگوشی میں جیسے اپنے آپ کو بتایا ''یہاں تو کچھ بھی نہیں کوئی بھی نہیں''

حویلی کے دروازے کے سامنے گاؤں کے بچے اس کی پجارو سے کھیل رہے تھے ہم اردگرد بیٹھے دیکھ رہے تھے اور گوپی اپنے وجود کی گہرائی میں اور گاؤں کی ترقی اور خوشحالی میں گم ہو جانے والے ماضی کو تلاش کر رہا تھا ''گوپی آج بانسری نہیں بجاؤ گے؟'' میں نے اسے سہارا دینے کو کہا

ہوش میں آتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا ڈرائیور کو آواز دی وہ ایک خوبصورت بکس لے آیا گوپی نے بکس میں سے بانسری نکالی اور کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا بانسری کے ایک ایک سوراخ پر انگلی رکھ کر ہلاتا رہا بچے اور نوجوان اس کی انگلیوں کا رقص دیکھ رہے تھے اور وہ ہر وجود سے بے خبر ہو گیا تھا وہ بانسری کے سوراخوں پر انگلیاں ہلاتا رہا بانسری کو دیکھتا رہا اور جب اس نے بانسری لبوں سے لگانے کے لئے اٹھائی تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے ''ملک جی! آپ کا گوپی تو آج مر گیا'' اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور بانسری اس کے ہاتھ سے گر گئی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساون کی کہانی

بادلوں نے گرج کر آواز دی تو بوڑھا ملاح جھونپڑی سے باہر نکل آیا اوپر راوی کے پاؤں کی طرف بجلی چمک رہی تھی اور سیاہ بالوں نے اسے بروقت خبردار کر دیا تھا ''میں کشتی دیکھ آؤں آج راوی کی نیت کچھ اچھی نہیں دکھتی'' اس نے جھونپڑی والوں کو اطلاع دی

بادل بہت گھنے تھے ان کی سیاہی بیلے کے وجود میں اتر رہی تھی اور بیلہ اور بھی سیاہ پوش ہو گیا تھا وہ سرکنڈوں میں سے تیز تیز چلنے لگا اس طرف جہاں اس شام کا آخری پور اتارنے کے بعد اس نے کشتی کا رسا موٹے درخت سے باندھ کر اگلی صبح تک کے لئے راوی کو خدا حافظ کہا تھا بادل کی گرج کڑک میں بدلنے لگی تو اس کے قدم اور بھی تیز ہو گئے راوی اور اس کے کناروں پر پھیلا ہوا جنگل بیلہ تو اس کا آبائی گھر تھا اس گھر میں تیز چلنے کے لئے اسے کسی اور کی چمک اور روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اپنے آبائی گھر میں اس کے پاؤں آنکھیں بن گئے تھے وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا اور اسے راوی کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا مگر راوی پرسکون تھا اس کی کشتی لہروں کی گود میں اونگھ رہی تھی اس نے کشتی کی ناک کی لوہے کی زنگ خوردہ نتھ میں سے ایک اور رسا گزار کر ایک درخت سے باندھ دیا

بادلوں کی کڑک میں اس نے ایک انسانی آواز بھی سنی تھی اور کشتی کی فکر میں اس پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا کشتی باندھ کر وہ اس آواز کو تلاش کرنے لگا مگر گھپ اندھیر میں گیلی ریت پر آواز کے قدموں کا کوئی نشان نہیں مل رہا تھا ملاحوں کے کان تو گونگی لہروں کی آواز بھی

سن لیتے ہیں اور اس نے وہ انسانی آواز بھی گم کر دی تھی جو بادلوں کی گرج کے درمیان میں اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی وہ فکر مند ہو گیا ''راوی کی نیت آج پھر خراب دکھتی ہے کوئی مسافر ادھر رہ گیا تو میں خواجہ خضر کو کیا جواب دوں گا''

گم شدہ آواز نے راوی کی لہروں سے اپنے سوال کا جواب طلب کیا تو بوڑھا ملاح خوش ہو گیا دریا کے کنارے گیلی ریت پر بیٹھا کوئی لہروں سے باتیں کر رہا تھا ''آپ نے دریا کے پار جانا ہے؟''

''جی ہاں مجھے ایک دریا کے پار اترنا ہے'' اس کسی نے اس کی طرف دیکھے بن جواب دیا

''اس وقت تو دوسرے کنارے نہیں جایا جا سکتا رات بہت اندھیری ہے اور راوی کی نیت اچھی نہیں دکھتی'' ملاح نے اسے اندھیری رات کے خطرے سے آگاہ کرنے کو کہا

''میرے دریا کا تو ایک ہی کنارہ ہے میں نے تو کسی اور کنارے نہیں اترنا یہ ایک کنارہ تو ختم ہو لے۔''

بوڑھا ملاح اس ایک کنارے والے دریا میں غوطے کھانے لگا ''ہم تو صدیوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ ہر دریا کے دو کنارے ہوتے ہیں ایک ہی کنارے والا دریا کہاں ہے''۔

اس آدمی نے کوئی چیز دریا میں پھینکی راوی کے خاموش پانی میں ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور ختم ہو گئی ''میں نہیں جانتا میں نہیں دیکھ سکتا کہ پتھر کہاں گیا ہے تو تو جانتا ہے تو تو دیکھ رہا ہے اور میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں دریاؤں کے مالک مجھے بھی بتا دے مجھے بھی دکھا دے کہ وہ کہاں ہے'' اس آدمی نے کہا اور خاموش ہو گیا جیسے جواب کا انتظار کر رہا ہو

''رات بہت اندھیری ہے اور آج راوی کی نیت خراب دکھتی ہے آپ میرے ساتھ بسیں اودھر میری جھونپڑی میں صبح پہلے پور میں آپ کو اودھر پہنچا دوں گا'' ملاح نے اس کے سوال کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا

''میں نے جہاں جانا ہی نہیں آپ مجھے وہاں کیسے پہنچا سکتے ہیں؟''

''وہ اودھر میری کشتی بندھی ہے درخت کے ساتھ میں یہاں کشتی چلاتا ہوں اور اودھر بیلے میں میری جھونپڑی ہے آج رات آپ میرے گھر بسیں میری بیوی آپ کے سفر کی سلامتی کی دعا کرے گی اور صبح میں پہلے پور آپ کو پار اتار دوں گا'' ملاح نے منت کے سے انداز میں منت کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاح کے حقے میں پانی نہیں ہوتا اور اس کی جھونپڑی میں مہمان نہیں ٹھہرتا جو بھی آتا ہے پار اتر جاتا ہے اور شام کو اپنی اپنی کشتیاں باندھ کر جب ملاح اپنی اپنی جھونپڑیوں کی طرف جاتے ہیں تو وہاں ریت پر صرف جانے والوں کے قدموں کے نشان ہی باقی ہوتے ہیں اور راوی ہوتا ہے بیلہ ہوتا ہے اور ملاح ہوتا ہے اور اس کی جھونپڑی ہوتی ہے جس میں کوئی مہمان نہیں ٹھہرتا اور سیاہ طوفانی راتوں میں ان کی جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے دیئے کسی مہمان کے لئے آہیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں ''چلیں آج رات آپ ہماری جھونپڑی میں بسیں میری بیٹی آپ کے لئے گرم گرم روٹیاں پکائے گی اور میری بیوی آپ کے سفر کی سلامتی کے لئے دعا کرے گی'' ملاح نے اپنی منت دہرائی

''تمہیں تو اس ساون کی کہانی یاد ہوگی تم تو یہیں ہوتے ہو گے ان دنوں؟'' اس آدمی نے اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے پوچھا

''نہیں! نہیں! مجھے نہیں یاد مجھے نہیں معلوم اس ساون کی کہانی'' بوڑھا ملاح کانپنے لگا

''تو پھر جاؤ اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس جاؤ آج راوی ساون کی وہ کہانی خود سنائے گا تم جاؤ جلدی کرو۔''

ملاح نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ''نہیں! نہیں! راوی اس ساون کی کہانی نہیں سنائے گا ایسا نہ کہو نہ کہو ایسا اب تو ادھر بیلے میں کوئی جگہ ہی نہیں بچی۔''

''سنائے گا راوی اس ساون کی کہانی آج ضرور سنائے گا'' وہ آدمی جیسے جلال میں آ گیا ہو ''میں وہ کہانی سن کر ہی اٹھوں گا یہاں سے''

''خدا کے لئے نہ کہو ایسا! اٹھ جاؤ یہاں سے چلو میں سناؤں گا آپ کو اس ساون کی کہانی پر وعدہ کرو کہ تم مجھے پھر کبھی اس ساون کی کہانی سنانے کو نہیں کہو گے میں تیسری بار اس ساون کی کہانی نہیں سنا سکوں گا'' ملاح کانپ رہا تھا

''اللہ آپ پر راوی کی منزل آسان کر دے اس کی ہوائیں آپ کی راہوں کے کانٹے اڑا لے جائیں'' ملاح کی بیوی نے جھونپڑی میں مہمان کا استقبال کیا

سیاہ گھٹائیں زمین کے اور بھی قریب آ گئی تھیں بیلہ خاموش تھا جھونپڑی کا دیا کانپ رہا تھا اور بوڑھا ملاح اپنے مہمان کو اس ساون کی کہانی سنا رہا تھا ''اس وقت ہمارا یہ بیلہ بہت آباد ہوتا تھا۔ بہت ہی آباد ہوتا تھا اور دور دور تک پھیلا ہوتا تھا ایسی راتوں میں جیسی آج کی

رات ہے بیلے میں مور ناچتے تھے ہرن دوڑے پھرتے تھے اور نیل گائے ادھر آ جاتے تھے ادھر تک جہاں ہم بیٹھے ہیں اور ہم سے مل کر کودتے ہوئے بیلے میں غائب ہو جایا کرتے تھے اور ساون برستے ہی راوی کے کناروں پر جنگل بیلے میں نئے ڈیرے لگ جاتے تھے دور دور سے چرواہے اپنے گلے ہانکتے ہوئے ساون منانے ادھر آ جاتے تھے اور جب رات ڈھلتی تھی تو وہ سب اپنے مویشی بیلے میں ہانک کر اپنی اپنی بانسریاں لے کر بیلے میں پھیل جاتے تھے اور پورے چاند کی رات ڈھلے ہم اپنی کشتیاں راوی میں ڈال دیتے تھے راوی کے پاک صاف پارے کی مانند چمکدار شفاف سینے پر چاند کی کرنیں منہ کے بل گر گر جاتی تھیں اور ہماری کشتیاں جھومنا شروع کر دیتی تھیں کوئی ملاح بانس چھوڑ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تو سارا بیلہ گونج اٹھتا تھا چرواہے بانسریاں رکھ کر ہیر گانا شروع کر دیتے اور راوی کی موجیں اور چاند کی کرنیں اور ملاحوں کے دل سب ناچنا شروع کر دیتے تھے سب ناچنے لگتے تھے'' بوڑھے ملاح نے ٹھنڈی آہ بھری ''آپ وعدہ کریں کہ پھر کبھی مجھے ساون کی کہانی سنانے کو نہیں کہیں گے''

مہمان بوڑھے نے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے ایک بار پھر اپنا وعدہ دہرایا تو بوڑھے ملاح نے کہانی آگے بڑھائی ''یہی دن تھے ہمارا بیلہ اس ساون میں بہت آباد تھا اور کسی کو بھی راوی کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا ہم ملاح اور راوی معلوم نہیں کب سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں ملاح اور دریا کبھی رخ نہیں بدلتے دریا جب سے پیدا ہوئے ہیں ایک ہی رخ بہے جا رہے ہیں پہاڑوں سے سمندروں کی طرف اگر دریا اپنا رخ اور ملاح اپنا مقام بدل لیں تو دونوں ختم ہو جائیں ہم ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں پر اس ساون میں راوی نے ہمیں بہت دھوکہ دیا تھا ہم ملاحوں نے کبھی راوی کو دھوکہ نہیں دیا پر اس ساون میں راوی نے ہمیں بہت دھوکہ دیا اور ہم اس کی نیت نہ سمجھ سکے اوپر کی طرف کئی روز سے بجلیاں چمک رہی تھیں مگر راوی میں پانی نہیں آیا تھا ہم حیران ہوتے تھے اور ہر شام اپنی اپنی کشتیاں موٹے رسوں سے باندھ کر آتے تھے جب اوپر اس طرف جدھر راوی کے پاؤں ہیں بجلی چمکتی ہے تو راوی میں طوفان ضرور آتا ہے ہم راتوں کو طوفان کا شور سن کر جاگ جاتے تھے اور بھاگتے ہوئے راوی کی طرف جاتے تو وہ نہایت خاموشی سے بہہ رہا ہوتا تھا ہم بڑے ڈرنے لگے تھے اور ہمیں راوی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی ہم ملاح لوگ بجلیوں سے نہیں ڈرتے پر اس ساون میں ہم راوی کی خاموشی سے بہت ڈرنے لگے تھے ساون آ جائے اور طوفان نہ آئے اور دریا میں موجیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیلے میں مور نہ ناچیں تو جان لیں کہ زمین پر آسمان سے کوئی آفت آنے والی ہے اور ہم کشتیاں چلانے والے سب کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں ہماری اپنی سلامتی پورے پور کی سلامتی میں ہوتی ہے اس ساون میں بجلیاں چمکتی رہیں اور راوی خاموش رہا اور ہم سب کی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے'' بوڑھا ملاح ایک بار پھر رک گیا اور اپنے بوڑھے مہمان سے ایک بار پھر وعدہ لیا کہ وہ پھر کبھی اس سے اس ساون کی کہانی سنانے کو نہیں کہے گا پھر اس نے اپنا گلا اور آنکھیں صاف کیں اور اس ساون کی کہانی سنانے لگا ''ایک شام ہم آخری پورا تار کر اور اپنی کشتیاں باندھ کر آ رہے تھے تو ہم بہت گھبرائے ہوئے تھے ہم ملاحوں کے دل کبھی نہیں ڈولتے ہماری کشتیاں طوفان میں تنکوں کی مانند ڈول رہی ہوں ہمارے دل تب بھی نہیں ڈولتے پر اس شام ہمارے دل ڈول رہے تھے اوپر کی طرف بجلیاں چمک رہی تھیں راوی خاموش تھا اور ہمارے دل ڈول رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کا چہرہ سرخ ہونے لگا بہت ہی سرخ خون کی مانند ہو گیا اور بجلیاں ہمارے سروں کے عین اوپر کڑکنے لگیں ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا زمین کانپ رہی تھی اور راوی بالکل خاموش تھا اسی طرح جس طرح آج خاموش ہے پھر ہم اونچے ٹیلوں کی طرف دوڑے ان ٹیلوں کی طرف جن پر ہم راوی میں طوفان کے وقت جاتے ہیں راوی خاموش تھا اور ہم دوڑے جا رہے تھے اور بیلے کے باسی چرندے بھی دوڑے جا رہے تھے پرندے چیخ رہے تھے اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے والا ہے اور اس ساون میں راوی نے پہلی بار ہمیں دھوکا دیا تھا راوی بالکل خاموش تھا اور ایک بوڑھا ملاح چلا رہا تھا ''لڑائی ہو گئی ہے لڑائی ہو گئی ہے ادھر اوپر کہیں جدھر سے راوی آتا ہے کہیں معصوموں پر ظلم ہو رہا ہے''

ہم نے بھی بچپن میں بوڑھے ملاحوں سے سنا تھا کہ جب زمین پر ظلم ہوتا ہے تو آسمان رونا شروع کر دیتا ہے پر ہمارے اردگرد تو زمین پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ لڑائی کیوں ہو رہی ہے اور وہ بوڑھا ملاح چلا رہا تھا ''چوغتوں کا قاتل گورا چلا گیا ہے اور لڑائی ہو رہی ہے۔''

ہم نے کہا گورا صاحب چلا گیا ہے تو چلا جائے ہم تو اس کے جانے کی خوشی میں کسی سے نہیں لڑتے کون ہے وہ بیوقوف جو گورے قاتل کے جانے کے دکھ میں لڑ رہا ہے اور زمین پر ظلم کر رہا ہے ہم ملاح تو سب کی سلامتی کی دعائیں مانگنے والے ہیں بادل گرجنے لگے بجلیاں

کڑکنے لگیں اور اوپر والے نے اوپر سے پانی کے سب در کھول دیئے اوپر کا پانی زمین کے نیچے کے پانی سے ملنے کے لئے تڑپنے لگا ہم سب کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور پھر راوی بھی جو کسی مجرم کی مانند خاموش تھا گرجنے لگا بہت گرجا راوی اس رات بہت گرجا تھا اور اوپر سے بہت پانی برسا تھا اور ہم نے اونچے ٹیلوں پر بیٹھ کر بہت دعائیں کی تھیں ہم ساری رات دعائیں کرتے رہے اور راوی گرجتا رہا'' بوڑھا ملاح ایک بار پھر رک گیا اور اپنے بوڑھے مہمان سے پوچھا ''تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا کہ آپ پھر کبھی مجھے اس ساون کی کہانی سنانے کو نہیں کہو گے۔''

مہمان نے اپنا سر ہلا کر وعدہ دہرا دیا

''صبح ہوئی تو اونچے ٹیلوں پر سے کیا دیکھتے ہیں کہ راوی نے اپنی ساری طوفانی مزیں لپیٹ لی ہیں اور بالکل خاموش ہے اور سڑا لے بہت شرمسار سا اپنی منزل کی طرف بہے جا رہا ہے'' بوڑھے ملاح نے کہانی شروع کی اور بانس پکڑ کر اندھیرے میں راوی کی طرف چلنے لگا اس کا بوڑھا مہمان بھی اس کے پیچھے چلنے لگا ''ہم بانس پکڑ کر پتن کی طرف چلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ادھر بیلے میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں کسی کا سر نہیں کسی کا بازو نہیں اور کسی کا.... بوڑھے ملاح نے اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا ''بس لاشیں ہی لاشیں تھیں مرد عورتیں بچے بوڑھے سروں والے سروں کے بغیر ہم ریت اٹھاتے تھے تو اس میں سے خون ٹپکنا شروع ہو جاتا تھا اور راوی میں پانی نہیں تھا صرف خون بہہ رہا تھا آپ وہ دیکھ رہے ہیں آج بھی راوی میں خون ہی بہہ رہا ہے اور اس ساون کے بعد سے ساون مہینے میں راوی میں خون ہی ہوتا ہے پانی پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ راوی خون سے بھر جاتا ہے'' ملاح نے دریا کے کنارے سے ریت مٹھی میں لی ''دیکھیں دیکھیں اس سے بھی خون ٹپک رہا ہے ہر ساون میں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

گیلی ریت میں سے پانی کے قطرے گر گر کر کنارے کی گیلی ریت میں جذب ہو رہے تھے اور وہ کشتی چلانے والے مضبوط بانس کی مدد سے اپنے وجود کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا ''لو دیکھو تم خود دیکھ لو اس ریت سے خون ٹپک رہا ہے'' اس نے اپنے مہمان کو گیلی ریت دیتے ہوئے کہا۔

مہمان نے وہ ریت مٹھی میں بند کر لی وہ دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مہمان نے دریا کے کنارے کی گیلی ریت اپنے رومال میں باندھ کر جیب میں ڈال لی ''اگر میں مرجاؤں تو یہ ریت میرے ساتھ دفن کر دینا'' اس نے بوڑھے نے ملاح سے کہا اور پھر جیسے اپنے آپ کو بتانے کے لئے کہا ''پر میں تو ابھی مر بھی نہیں سکتا''

بوڑھا ملاح پہلی بار اس کی کسی بات پر چونکا

''وہ ساون اور آج کا ساون'' ملاح نے ایک بار پھر کہانی شروع کی ''وہ ساون اور آج کا ساون جب بھی ساون آتا ہے ادھر بہت دور اوپر جہاں آسمان اور زمین ملتے ہیں رات بھر بجلی چمکتی رہتی ہے اور پھر راوی میں طوفان آجاتا ہے اور راوی کی طوفانی لہریں سارے بیلے میں پھیل جاتی ہیں اور ان انگنت قبروں پر نئی مٹی ڈال کر صبح تک واپس چلی جاتی ہیں اس بیلے میں ہر طرف قبریں ہی قبریں ہیں جن پر ہر سال راوی نئی مٹی ڈالتا ہے وہ قبریں ہمیں نظر نہیں آتیں لیکن راوی کو سب معلوم ہے کہ کون سی قبر کہاں ہے'' وہ چلتا چلتا زمین پر بیٹھ گیا تو اس کا مہمان بھی اس کے پاس بیٹھ گیا ''میں نے اپنے سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس ساون کی کہانی کبھی کسی کو نہیں سناؤں گا کئی سال پہلے جب میں نے یہ کہانی اس شخص کو سنائی تھی جو اپنے بیٹے کے ساتھ دفن ہونا چاہتا تھا اور ان قبروں میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر ڈھونڈتا پھر رہا تھا جو زخمی تھا اور اس کے سامنے اس کا سارا خون ریت نے چوس لیا تھا اور اس کے اکلوتے بیٹے کی لاش راوی نے چھین لی تھی اور وہ کہتا تھا کہ وہ وہاں تک اپنے بیٹے کی قبر کی تلاش کرنے جائے گا جہاں تک راوی جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک اس کے بیٹے کی قبر نہیں مل جائے گی اور جب وہ مرے گا تو اس کی قبر اس کے بیٹے کی قبر کے پاس بنے گی اور وہ رات بھی جب میں نے پھر کسی کو اس ساون کی کہانی نہ سنانے کا عہد کیا تھا اسی طرح کی تھی اور راوی اسی طرح خاموش تھا اور آج پھر مجھے اس کی نیت پر شبہ ہو رہا ہے'' وہ اٹھ کر تیز تیز اپنی جھونپڑی کی طرف چلنے لگا ''اب پتا نہیں اسے اپنے بیٹے کی قبر ملی ہے یا نہیں''

''نہیں ابھی نہیں ملی'' اس کے بوڑھے مہمان نے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جدھر شام سے بجلیاں چمک رہی تھیں ''جب تک اسے اس کے بیٹے کی قبر نہیں ملے گی وہ مر نہیں سکے گا''۔

بوڑھے ملاح نے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے اپنے بوڑھے مہمان کی طرف دیکھا ''تم! تم!'' وہ اس سے زیادہ کچھ بھی کہہ نہ سکا اور دوڑنے لگا بجلیاں ان کے سروں کے اوپر کڑکنے لگی تھیں وہ اپنے مہمان کا بازو پکڑ کر دوڑا جا رہا تھا اور چلا رہا تھا ''بھاگو! بھاگو!

طوفان آ رہا ہے'' بیلے کے چرندے بھی اپنے اپنے بچے اپنے منہ میں لئے اونچے ٹیلوں کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ بوڑھا ملاح جھونپڑیوں میں سونے والوں کو آوازیں دے رہا تھا اور اپنی جھونپڑی کی طرف دوڑا جا رہا تھا اور کسی گھاٹی پر اس کا بوڑھا مہمان کہیں پیچھے رہ گیا تھا

اگلی صبح جب سورج آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو راوی ایک بار پھر بیلے میں پھیلی نامعلوم شہیدوں کی قبروں پر نئی مٹی ڈال کر واپس جا چکا تھا اور بوڑھا ملاح اور اس کی بیٹی اپنے مہمان کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے ایک ٹیلے پر کیپٹن.... خان شہید کی پختہ قبر کے ساتھ لیٹا کپڑے میں منہ چھپائے کوئی سو رہا تھا ''آپ نے رات کوئی اجنبی مسافر تو ادھر نہیں دیکھا تھا؟'' ملاح نے اسے آواز دی

ملاح آوازیں دیتا رہا اور سونے والا سویا رہا اس کی بیٹی نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو وہ پھر بھی نہ جاگا ''بابا آپ کا مہمان تو مر گیا ہے'' اس کی آواز میں گہرا دکھ تھا بوڑھے ملاح کے دکھ میں خوشی بھی تھی ''آخر اسے اپنے بیٹے کی قبر مل ہی گئی''

''بابا آپ کے مہمان کے چہرے پر تو خوشی ہے'' اس کی بیٹی نے اجنبی بوڑھے کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعاون

دکانیں کھلنے کا ابھی وقت نہیں تھا دکانوں پر کام کرنے والے ملازم اور مزدوری پیشہ جو جلدی آ گئے تھے اِدھر اُدھر ٹولیوں میں بیٹھے اخباری خبروں پر لڑ جھگڑ رہے تھے بعض تو رابورا کے غاروں میں اسامہ بن لادن کو ڈھونڈ رہے تھے کچھ بش اور جھاڑی کی لڑائی میں الجھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان میں میرے دفتر کی سیڑھیوں پر دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بے سدھ پڑا تھا اس کے سفید سفید بازوؤں اور ٹانگوں پر زخموں کے نشان تھے نئے اور پرانے زخموں کے سرخ سرخ نشان جن کے درمیان میں مزید زخموں کے لئے کچھ بے نشان جگہ بچ گئی تھی اور ایک اس کا ہم سن لڑکا اسے اٹھانے اور جگانے میں لگا ہوا تھا ''باسی! باسی! لو یہ پانی پیو اٹھو ماسی اڈیک رہی ہوگی۔''

باسی نے ایک کروٹ لی ''ہوں! کون؟ دیما! کیا ہے؟ تم جاؤ میں آتا ہوں''

''باسی! باسی! لو پیو پانی! اٹھو'' پانی کا گلاس اس کے کانپتے ہاتھوں میں ڈول رہا تھا ''بابو جی آپ جائیں میں ابھی اٹھا لیتا ہوں اسے آپ کا راستہ نہیں رکے گا'' مجھے پاس کھڑا دیکھ کر دیما پریشان ہونے لگا

''کیا ہوا ہے اسے؟'' میں نے ویسے ہی یا شاید اس کی پریشانی دیکھ کر پوچھ لیا تھا

''کچھ نہیں بابو جی کچھ نہیں ہوا اسے یہ ٹھیک ہی ہے آپ جائیں میں ابھی اسے اٹھا لوں گا یہ ٹھیک ہی ہے آپ کا راستہ نہیں رکے گا'' دیمے نے مجھے تسلی دی اور اسے جھنجھوڑنے لگا ''باسی!

باسی! اٹھو ماسی اڈیک رہی ہے۔''

بیڈن روڈ پر اور اسکے پچھواڑے رائل پارک میں صبح کے وقت ایسے کئی زخمی لڑکے اور ہیروئن کے ایندھن سے اڑنے والے جہاز دفتروں کی سیڑھیوں پر ہڑیوں کے نیچے اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر پڑے ہوتے تھے وہ اس علاقہ کی دن رات کی زندگی کا حصہ ہوتے تھے اور لوگ ان کا اور ان کے زخموں کا کوئی نوٹس نہیں لیا کرتے تھے پر باسی کے ننگے بازوؤں اور ٹانگوں پر انگنت نشان تھے اور وہ سرخ سرخ نشان میرے دماغ کی سکرین پر چمکنے لگے جیسے بچپن کی راتوں میں نیلے آسمان پر دیکھے انگنت سرخ ستارے تصور کی آنکھ کھولتے ہی چمکنے لگ جائیں

دفتر میں کرسی پر بیٹھا آنکھیں بند کئے میں باسی کے بازوؤں اور ٹانگوں پر زخموں کے سرخ سرخ نشان گنتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے زیادہ ترس کس پر آنا چاہیے باسی پر جو بے نیاز اور بے سدھ پڑا تھا یا دیے پر جو اسے اٹھا اٹھا کر جگا جگا کر تھک گیا تھا پریشان ہو گیا تھا اور مجھے تسلی دے رہا تھا کہ وہ میرے دفتر کا راستہ کلیئر کر دے گا اور باسی کو اٹھا لے جائے گا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا چائے کے کپ میں بھی وہ زخم چمکنے لگے تو ملازم کو باسی اور دیے کو اوپر دفتر میں لا کر ناشتہ کرانے کو کہہ کر میں چائے پینے کی کوشش کرنے لگا

ان دونوں کے پھٹے ہوئے لباس تہہ در تہہ میل کچیل سے بکرے کی سوکھی کھال کی مانند اکڑ گئے تھے سر کے بال ایسے تھے جیسے کسی نے ان کے سروں پر کسی لیسدار چیز کی لیپ کر دی ہو ان کے جسموں اور کپڑوں کی بو ناگوار ہو رہی تھی ملازم منہ ہاتھ دھلا کر انہیں ناشتہ کرانے لگا اور میں گلے اور منہ سے بھی اوپر تک ناک تک چائے کے کپ میں ڈوب گیا وہ نہ خوش تھے اور نہ ہی پریشان دکھائی دیتے تھے ایسے ہی دکھائی دیتے تھے جیسا میں اپنے کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کپ میں ٹھنڈی چائے کی سطح پر بہت سے سوال تیرنے لگے تھے اور میرے ہر سوال پر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھا دیتے تھے اور کوئی نئی بات شروع کر کے بات دوسری طرف لے جاتے تھے میرے اندازے اور اپنی اپنی عمر کی نسبت سے وہ بہت سیانے ہو چکے تھے اور اخبار کی موٹی سرخیوں کی تہہ میں چھپی خبر نکال لیتے تھے اور ہر سوال بڑی آسانی سے کھیل رہے تھے اور میں اس سے زیادہ کچھ بھی ان سے معلوم نہیں کر سکا تھا کہ ان میں سے ایک کا نام باسی ہے اور دوسرے کا نام دیما ہے ٹیلی فون نے آواز دی میں جواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں الجھ گیا اور وہ دونوں پیشاب کا بہانہ کر کے بھاگ گئے

رائل پارک قسم قسم کے دھندوں کی میلہ منڈی ہے فلمیں بنانے چلانے اور دکھانے والوں کے مخصوص دھندوں کا گڑھ ہے ان دھندوں سے وابستہ ہر قسم کے خواتین وحضرات کی قسم قسم کی ضروریات اور لوازمات کے دھندوں کی مارکیٹ ہے جہازوں کا شہر میں اہم ترین اڈہ ہے ان کے ایندھن کا ڈپو ہے اپنے والدین اور دوسروں کے والدین کے گھروں سے بھاگے ہوئے اور بھگائے گئے نوعمر لڑکوں کی قسم قسم کی مصروفیات کا رائل پارک ہے اور لاہور کی اہم ترین فوڈ سٹریٹ ہے لکشمی چوک اور آس پاس کے ہوٹلوں پر زندگی رات بھر جوان اور جاگتی رہتی ہے اور اپنے والدین کے اور دوسروں کے والدین کے گھروں سے بھاگے اور بھگائے نوعمر لڑکے اس جیتی جاگتی زندگی کی ضرورت ہیں جب تک رات جاگتی ہے وہ گاہکوں کی گاڑیاں دھوتے ہیں جوتے صاف کرتے ہیں ان کا سامان چراتے ہیں اور جیبیں ٹٹولتے رہتے ہیں اور جو کوئی ان دھندوں کے درمیان میں پکڑا جائے وہ اپنی جیب سے بلیڈ نکال کر اپنے کو لہولہان کر لیتا ہے اور اگر کوئی ان کے لہو سے خوفزدہ نہ ہو جائے تو وہ مل جل کر اس کی اور اس کی گاڑی کی مرمت بھی کر دیتے ہیں اور اپنے لہولہان ساتھی کو صمد بونڈ سنگھا کر کسی دفتر کی سیڑھیوں پر اردگرد کی ریڑھیوں کے نیچے سکون کے حوالے کر دیتے ہیں اور جب رات کی آنکھوں میں نیند کا خمار گہرا ہو جاتا ہے تو وہ سب صمد بونڈ سونگھ کر بند دکانوں کے تھڑوں پر پھٹوں کے اوپر بے سدھ ہو جاتے ہیں وہ اس علاقہ کی راتوں کی روشنیوں اور دن کے اندھیروں کی زندگی ہیں اور مجھے ان دونوں کے بھاگ جانے پر حیرانی نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے کچھ اس قسم کی خوشی محسوس کی تھی جیسے کوئی بندہ سمندر کے کنارے تپتی ریت پر تڑپتی مچھلی کے سمندر میں واپس چلے جانے پر محسوس کیا کرتا ہے

میرے دفتر کے پچھواڑے پیپل کا ایک بہت پرانا درخت ہے گرم دنوں میں جب کبھی بجلی دم توڑ جائے تو میں پچھلے برآمدے میں کرسی ڈال کر اس کے تروتازہ پتوں میں ٹھنڈک ڈھونڈتا ہوں بجلی کے دم توڑنے کے ایسے ہی لمحوں میں ایک دوپہر میں پچھلے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ پیپل نے اداس کر دینے والا کوئی گیت شروع کر دیا اور پتے تالیاں بجانے لگے بندہ کوئی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا اور اداس کر دینے والے نغمے کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی برآمدے کے سامنے کھلی چھت کے کنارے لگی ریلنگ کے اوپر سے دیکھا تو پیپل کے قدموں میں ایک

دوسرے میں پیوست تین لڑکے لہر لہر جھوم رہے تھے درمیان والا لڑکا کوئی پشتو گیت گا رہا تھا اس کے دونوں طرف کے لڑکے اس کے سر سے سر ملائے ہوئے تھے اور جھوم رہے تھے پیپل کے پتوں کی تازگی سے گھل مل کر نغمے کی مٹھاس میرے جسم میں اترنا شروع ہی ہوئی تھی کہ نغمہ اچانک دم توڑ گیا ویران گلی کی اندھی نکڑ سے ''اوئے باسی! اوئے دیسے! کہاں مر گئے ہو! اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے'' کی آواز آئی اور مستی میں جھومتے تینوں لڑکے ہوش میں آ گئے ایک دوسرے سے الگ تھلگ ایسے اٹینشن کھڑے ہو گئے جیسے کسی وی وی آئی پی کے استقبال کی ڈیوٹی پر ہوں ماسی ہانپتی کانپتی ڈگمگاتی سنبھلتی ''اوئے باسی! اوئے دیسے! کہاں مر گئے ہو! اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے'' چلاتی گلی سے برآمد ہوئی تو تینوں نے احترام میں سر جھکا لئے ماسی کے پاؤں زمین پر جم نہیں رہے تھے معلوم ہوتا تھا اگلا قدم اٹھاتے ہی وہ ڈھیر ہو جائے گی انہیں دیکھ کر قدم جمانے کی کوشش میں وہ دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے حواس گرفت میں لانے کی کوشش کرنے لگی باسی اور دیما اس کے پاؤں دبانے لگے ''اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے! اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے! اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے'' وہ بڑبڑانے لگ گئی

باسی اور دیما خاموش تھے سر جھکائے اس کے پاؤں دبا رہے تھے ''تیری ماں مر جائے گی دوائی کے بغیر شرم کر دیسے شرم کر نہیں تو تیری بھی دُم نکل آئے گی کتے اور بے شرم میں دُم کا ہی تو فرق ہے'' ماسی نے ڈانٹا

دیما سر جھکائے اس کے پاؤں دباتا رہا

''تیرے بہن بھائی مر جائیں گے بھوک سے تو یہاں گانے گا رہا ہے تیری ماں نے تمہیں تان سین بننے بھیجا تھا ادھر یا کمائی کرنے بھیجا تھا'' ماسی نے باسی کا کان مروڑتے ہوئے پوچھا ''بتا! بتا تا کیوں نہیں؟ میں بناتی ہوں تیرا تان سین''

باسی ہونٹ دبا کر درد چھپا رہا تھا

ماسی چلا رہی تھی ''تیری بھی تو کوئی ماں ہو گی ہی'' اس نے گیت گانے والے لڑکے کا کان کھینچتے ہوئے کہا ''پتہ نہیں وہ بیچاری کون ہے جس نے تمہیں اتنی دور بھیجا ہے اور تو یہاں گانے گا رہا ہے اور نسوار کھا رہا ہے نسواری تیری تو دم بھی نہیں نکل سکتی دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے میں تیری شکل نہیں دیکھنا چاہتی تو خود بھی حرام خور بن گیا ہے اور دوسروں کو بھی تان سین بنا رہا ہے اللہ تیری ماں پر رحم کرے''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی آنکھیں بند کر کے اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ لگا دیا وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی نسواری نے کوڑا کرکٹ اور کچرے کے ڈھیروں سے چنے کاغذوں کی بوری کندھے سے لٹکائی اور بھاگ گیا باسی اور دیما سر جھکائے ماسی کے پاؤں دباتے رہے

میں ریلنگ سے لگا سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کسی فلم کا کوئی منظر ہی تو نہیں ماسی دیما نسواری اور باسی اپنے اپنے حصے کا پارٹ ہی تو ادا نہیں کر رہے اور اگر یہ کسی فلم کا منظر نہیں انسانی زندگی کا ایک منظر ہے تو رائل پارک کے فلمیں بنانے والے یہ منظر اپنی فلموں میں کیوں نہیں دکھاتے؟

ماسی ایک بار پھر ہوش میں آ گئی ''یہ لو یہ ہے تمہاری سارے ہفتے کی کمائی اس بیچاری تمہاری ماں کا اس سے کیا بنے گا'' اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر دیے کو تھما دیا اور دوسرا لفافہ باسی کو تھما دیا ''گنو اس کو یہ کمایا ہے تم نے سارے ہفتے میں''

باسی نے اسی طرح سر جھکائے لفافہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا تو ماسی نے اپنی جیب سے ایک اور لفافہ نکالا ''یہ لو یہ بھی دے دینا ان بے چاریوں کو ان کا کچھ تو بن جائے انہیں کہنا صبر کریں صبر یہ دن بھی ختم ہو جائیں گے یہ میری طرف سے دے دینا انہیں''

انہوں نے پانچ پانچ سو کا وہ نوٹ بھی اپنی اپنی کمائی کے لفافوں میں ڈال لیا

''وہاں ماں کے گوڈے سے لگ کر نہ بیٹھے رہنا جلدی آ جانا کل اتوار ہے بہت آئیں گے آج حرام کی کمائی والے اپنے مشکوں جیسے پیٹ حرام سے بھرنے جلدی لوٹ آنا اور دیکھو کوئی بڑا زخم نہ لگا لینا جاؤ جلدی جاؤ اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرے''

دیما اور باسی چلے گئے اور ماسی وہیں بیٹھی رہی وہ ایسے نڈھال ہو رہی تھی جیسے بہت لمبا سفر کر کے یہاں تک پہنچی ہو اور چلتے چلتے اس کے پاؤں جواب دے گئے ہوں اور ابھی اسے بہت دور جانا ہو اور اس لمبے اور کٹھن سفر کے لئے ہمت ذخیرہ کر رہی ہو اس نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا موٹا میلا سا کاغذ نکالا بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ اس کی تہیں کھولیں اسے غور سے دیکھا اور پھونک مار کر ناک کے سامنی رکھ لیا کچھ دیر وہ کاغذ سونگھتی رہی اور پھر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگی اور سنبھل کر دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی جیسے نئے سفر کے لئے نئی ہمت جمع ہو گئی ہو

تین جہاز اپنے اڈے کی طرف محو پرواز تھے ''وہ پاویں پٹھان ای ہیں پر ہیں تو وہ بھی مسلمان اور وہ کتے کا بچہ بش ان بے چاروں پر بمباری کر رہا ہے ان کے بچے مار رہا ہے

میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو دیکھ لوں گا میں اسے'' ایک جہاز اونچی آواز میں چلا رہا تھا ''میں تے اودھی ماں.....''

ماسی نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو گالی اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی وہ تینوں پیپل کے قدموں میں بچھے کوڑے کرکٹ کے فرش پر بیٹھ گئے ماسی انہیں گھورتی ہوئی اٹھ کر چل دی وہ اسے دور تک دیکھتے رہے جب وہ ان کی آوازوں کی پہنچ سے نکل گئی تو ایک جہاز نے سرگوشی کی ''ماسی کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کر دینا کوئی نیا وکھت پڑ جائے گا مجھے تو یہ بھی امریکہ کی ایجنٹ معلوم ہوتی ہے بہت دولت ہے اس کے پاس پکی ایجنٹ ہے یہ امریکہ کی''

''بش میرا کیا پُٹ لے گا کر دے ماسی میری رپورٹ! اسامہ کا تو وہ.....پُٹ نہیں سکا میرا پُٹ لے آ کے جو کچھ پُٹ سکتا ہے'' اونچی پرواز میں جہاز پھر سے چلانے لگا

''ماسی تو فرشتہ ہے فرشتہ ہم لوگوں کے لئے وہ بڑا سہارا ہے میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا سارے کان کھول کر سن لو وہ جو اس روز بے چارہ چیلانہ ملنے سے مر گیا تھا اس کی تو قبر کا خرچہ بھی ماسی نے دیا تھا'' دوسرا جہاز پوری قوت سے چلایا

ماسی ابھی عمر کی اس حد سے بہت دور تھی جہاں سے کسی خاتون کے ماسی ہونے کا آغاز ہو سکتا ہے پر سب ہی اسے ماسی کہتے تھے جہاز، بھاگے بھگائے لڑکے، سگریٹ پان بیچنے والے سب ہی اسے ماسی کہتے تھے اور وہ سب کی ماسی بنی رہتی تھی محلہ کے بچوں کی عورتوں اور مردوں کی دکانداروں کی وہ سب کی ماسی تھی اور سب اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کی گالیاں سن کر بھی خاموش رہتے تھے ماسی نے رائل پارک کے فلمی کلچر کی کوکھ سے جنم لیا تھا اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ کر کسی فالتو اداکارہ کے کوٹھے پر جا بسا تو وہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہی سب کی ماسی بن گئی تھی اور اپنے باپ کی زندگی میں ہی اس نے گالیاں دینا اور نالیوں میں گرنا سیکھ لیا تھا اور اس کا باپ اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھوا کر مر گر گیا تھا اور وہ اپنی بیمار ماں کی خدمت کرتی تھی اور فلم والوں اور جہازوں کو گالیاں دیا کرتی تھی اور کوئی بھی اس کی گالی کا برا نہیں مانتا تھا۔

موسم بدل گیا تھا پیپل کے پتے ایک بار پھر زرد ہو گئے تھے اور ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے تھے اور گلی میں کوڑے کے ڈھیروں پر ادھر اُدھر اڑتے پھرتے تھے شہد کی مکھیوں کے چھتے جو گرم دنوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہرے بھرے پتوں میں چھپے ہوتے تھے بے پردہ ہوگئے تھے اور مکھیوں میں اور جہازوں میں کبھی کبھار کوئی مقابلہ بھی ہو جاتا تھا ایک روز میں دفتر پہنچا ہی تھا کہ گلی میں جہاز شور مچانے لگے ''ذرا دیکھو تو یہ شور کیسا ہے مکھیاں ہوئیں تو کھڑکیاں اچھی طرح بند کر لو'' میں نے ملازم کو خبردار کیا۔

''مکھیاں تو نہیں جہاز آپس میں لڑ رہے ہیں'' اس نے آ کر خبر دی۔

میرے لئے یہ حیران کن خبر تھی میں نے جہازوں کو کبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا وہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے مل جل کر رہتے تھے کسی کے پاس چٹیا نہ ہو تو اپنے پاس سے دوسروں سے مانگ کر اس میں ایندھن بھر دیتے تھے کوئی چل نہ سکے تو اسے اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے نالیوں میں گرے جہازوں کو نکالنے کی کوشش میں خود بار بار نالیوں میں گرتے تھے اور آپس کے جھگڑے آپس میں مل بیٹھ کر نپٹا لیتے تھے وہ بہت ہی جہاز دوست ہوتے تھے اور آپس میں کبھی نہیں لڑتے تھے تجسس اوڑھے میں باہر نکلا تو گلی میں باسی اور دیما لہولہان کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے اور جہازوں نے ان دونوں کو پکڑا ہوا تھا اور شور مچا رہے تھے ایک جہاز ایک بڑی سی اینٹ اٹھائے باسی کے پاس کھڑا تھا ''یہ لے بابو مار میرے سر میں یہ اینٹ دیے کو جانے دے وہ بے چارہ مر گیا تو تیرا کیا بنے گا؟ اپنا نقصان کیوں کرتا ہے؟ مرنا تو سب کو ہے پر بندے کو موت تو عزت کی مرنا چاہیے لے مار یہ اینٹ میرے سر میں کر لے اپنا غصہ ٹھنڈا''۔

گلی کی نکڑ کی طرف سے ماسی کی آواز بلند ہوئی تو جہاز ایک ایک کر کے پرواز کرنے لگے باسی اور دیما جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے وہیں جہاں جہاز انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کو قابو کئے کھڑے تھے ان کی زبانیں گنگ ہوگئیں پاؤں مٹی نے پکڑ لئے نسواری اور ماسی دوڑے آ رہے تھے ماسی ''اوئے بے شرمو کچھ شرم کرو اللہ تمہاری ماؤں پر رحم کرنے'' چلاتی ڈگمگاتی دوڑی آ رہی تھی اس کا جسم کانپ رہا تھا ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور وہ ہانپتی کانپتی دوڑی آ رہی تھی باسی اور دیما وہیں جہاں تھے خاموش کھڑے رہے اور ماسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز میں رونے لگی باسی اور دیما آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئے اور دونوں اس کے ساتھ مل کر رونے لگے وہ تینوں روتے رہے روتے رہے جب ان کے آنسو ختم ہوگئے تو ماسی نے اپنے ڈوپٹے سے دیے کے اور باسی کے آنسو پونچھے ان کے چہروں پر سے خون صاف کیا اور ان کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگی

ان دونوں کے سر جھکتے جھکتے زمین سے جا لگے تھے اور وہ سب خاموش تھے ماسی بھی دیما بھی باسی بھی اور نسواری بھی جب خاموشی کا بوجھ برداشت سے بڑھنے لگا تو نسواری نے اپنی زبان کو حرکت دی ''اخبار میں خبر چھپا تھا کہ ان پولیس والوں نے ان شیعہ والوں کو مارنے والا بندہ پکڑ لیا ہے اس بندے کی تصویر بھی تھی اخبار میں دیے نے دیکھ کر کہا یہ تو میرا باپ ہے اور یہ جنت میں جائے گا باسی نے کہا جنت میں تو میرا باپ ہے تیرا باپ تو وہاں نہیں جا سکتا بس اس پر ان کا لڑائی ہو گیا باسی کہتا ہے اس کے باپ کو ان لوگوں نے مار دیا تھا جو شیعہ والوں کو مارتے ہیں اس لئے وہ جنت میں چلا گیا تھا دیما کہتا تھا جنت میں تو اس کا باپ جائے گا جو شیعہ والوں کو مارتا تھا بس اتنی سی بات پر ان کا لڑائی شروع ہو گیا''

''پھر تو یہ جنت جانے کا کھیل ہے لڑائی تو نہیں یہ لڑائی کیسے ہو گئی؟ سب لوگ جنت میں جانا چاہتے ہیں یہ تو جنت جانے میں ایک دوسرے سے تعاون کی نیکی ہے مدد ہے ایک دوسرے کی جنت جانے میں چلو نسواری ہم چلیں ہم کیوں دوزخی بنیں انہیں جنت جانے سے روک کر'' ماسی نے نسواری کا بازو پکڑا اور لڑکھڑاتی ہوئی واپس چل دی گلی کی نکڑ پر پہنچ کر اس نے قہقہہ لگایا

''اٹھو کھیلو جنت جانے کا کھیل تم بھی جلدی کرو''

باسی اور دیما جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے افسردہ خاموش اور زخمی

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائیں جیوا

پھٹے ہوئے کپڑے، ننگے پاؤں، سر میں دھول اور آنکھوں میں بھرے شعلے وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گیا تھا جیسے ہاڑھ کی کسی گرم دوپہر میں واورولا آئے اور اس میں سے کوئی خوفناک آنکھوں والی چیز برآمد ہو جائے ''آج کا سورج غروب ہونے تک تم یہاں سے دفان نہ ہوئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس نے لاٹھی لہراتے ہوئے مال افسر کو دھمکی دی

میں اسے کئی سال سے جانتا تھا میں ہی کیا بھسین کے بچے بوڑھے عورتیں مرد سب ہی سائیں جیوا کو جانتے تھے وہ بہت ہی مسکین قسم کا سائیں ہوتا تھا کبھی کسی نے اسے آواز اونچی کرتے نہیں سنا تھا اور اس روز وہ بہت غصے میں تھا اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں وہ لاٹھی لہرا رہا تھا اور جلال اس کے وجود پر غالب آ گیا تھا ''زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنا بدبودار وجود یہاں سے دور دراز لے جاؤ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے سکول سے چلے جاؤ''

مال افسر کی حالت تو ایسے ہو گئی جیسے موت کے فرشتہ نے پاؤں سے شروع کر کے کمر تک اس کی جان نکال لی ہو وہ ہلنا چاہتا تھا مگر ہل نہیں سکتا تھا بولنا چاہتا تھا اور بول نہیں سکتا تھا اور تحصیلدار، گرداور، پٹواری، گاؤں کا نمبردار اور حاضر سائل سب خوفزدہ ہو گئے تھے ابھی تو وہ سب ہنس رہے تھے جنگ زدگان کی آبادکاری کے خاکوں میں خوبصورت رنگ بھر رہے تھے اور اب سارے ہی دم بخود تھے خوفزدہ تھے اور سائیں جیوا نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر ان کے

رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا سائیں اکیلا ہی سب پر لاٹھی تانے کھڑا تھا اور وہ سارے ہی اس کے جلال کی ہیبت کی زد میں آ گئے تھے۔

گاؤں کے جنوب مشرق میں ہسپتال سے ملے سکول سے آگے ایک ویران بے آباد میدان ہوتا تھا جب کبھی ہندوستان کی طرف آسمانوں سے پانی وافر برس جاتا تھا تو وہ میدان جل تھل ہو جاتا تھا اور پانی سوکھ جانے پر پھر سے پانی کے لئے دعائیں شروع کر دیتا تھا اس میدان کے کنارے کے ساتھ ایک ویران ٹیلہ تھا جس کی ڈھلوان پر گئے گزرے زمانوں میں بنائی ایک قبر تھی وہ قبر کس کی تھی کوئی نہیں جانتا تھا قبر کس نے بنائی تھی کب بنائی تھی کسی کو کچھ علم نہیں تھا اس قبر کے قریب اور کوئی قبر نہیں تھی قبر کے گرد چھ آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی جس میں بغیر کواڑوں کے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا اتنا چھوٹا کہ چھوٹے سے چھوٹے قد کے بندے کو بھی اس میں سے گزرنے کے لئے دوہرا ہونا پڑتا تھا بے آباد میدان، ویران ٹیلہ اور ایک پرانی قبر اور اس کے پاؤں میں پرانے درختوں کا جھنڈ اور سائیں جیوا اور اس کا کتا ڈبو

اس قبر پر نہ کبھی کوئی عرس ہوتا تھا نہ میلہ لگتا تھا اور نہ ہی کوئی نذر نیاز گزارنے اور چڑھاوا چڑھانے آتا تھا سائیں جیوا اس کے مجاور ہوتے تھے ہو سکتا ہے وہ مجاور نہ ہوں کچھ اور ہوں مگر جو کچھ بھی تھے سب کچھ وہی ہوا کرتے تھے اور دن رات کے ہر لمحہ میں آندھی اور طوفان میں ڈبو کتا ان کے ساتھ رہتا تھا سائیں جی بولتے بہت کم تھے اور ان کا کتا بھونکتا بہت تھوڑا تھا مگر اس روز سائیں اتنا زیادہ بول رہا تھا کہ اور کسی کو بولنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی

اکیلی قبر کے پاؤں سے لپٹے بوڑھے درختوں کے جھنڈ سے ذرا آگے آم کا ایک باغ تھا اس باغ سے آگے ایک اور باغ تھا اور ایک سے ملے ایک آم کے باغوں کا وہ سلسلہ ہندوستان کی سرحد پر ٹھٹھی کوڈا تک چلا گیا تھا سرحد سے آگے بھی پل کنجری تک باغ ہی باغ تھے جب ساون بھادوں میں برکھا رنگ دکھاتی تھی اور گنے چری اور چاول کی فصلیں سرمئی لباس پہن لیتی تھیں تو باغوں میں بچھے سبزہ کے قالینوں پر مور مستانہ وار ناچتے اور گاتے رہتے تھے میں جب کبھی صبح سویرے موروں کا ناچ دیکھنے اور گیت سننے جاتا تھا تو سائیں جیوا اپنے کتے کے ساتھ کسی درخت کے نیچے خاموش پڑے ہوتے تھے اور ان کے چاروں طرف مور ناچ رہے ہوتے تھے گا رہے ہوتے تھے اور دن رات کے ہر لمحہ میں ان کا ساتھی کتا موروں کی محفل میں بھی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سائیں جی ڈبو کہاں گیا وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں؟'' میں نے ان کی توجہ مال افسر سے کتے کی طرف موڑنا چاہی۔

''میں نے اس لاٹھی کے ساتھ اسے مار دیا تھا آج کے سورج کے ساتھ اگر یہ سکول سے دفان نہ ہو گیا تو میں اسے بھی کتے کی موت ماردوں گا''

میں سائیں جیوا کے بارے میں پریشان ہونے لگا اللہ نہ کرے سائیں کے ساتھ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟ اس نے اپنا جان سے پیارا کتا مار دیا ہے مال افسر کو مار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے چلا رہا ہے لاٹھی لہرا رہا ہے یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ایسا نہیں ہوتا تھا چھ ستمبر کی صبح تک یہ ٹھیک ٹھاک تھا ہم اسے اور اس کے کتے کو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئے تھے یہ گولوں اور گولیوں کے ناچ کا تو کہیں اثر نہیں ہو گیا سائیں کے دماغ پر؟

پانچ ستمبر کی صبح سے ریڈیو نے بتانا شروع کیا تھا کہ پاکستانی فوجیں کشمیر کے محاذ پر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں دن کے بعد رات بارہ بجے تک ہم ہسپتال کے لان میں بیٹھے اس پیش قدمی پر خوش ہوتے رہے تھے میں، ہسپتال کا بنگالی ڈاکٹر، ہائی سکول کا سیکنڈ ہیڈ ماسٹر، یونین کونسل کا سیکرٹری اور سائیں جیوا ریڈیو سیٹ کے گرد بیٹھے خوشی کی خبریں سنتے رہے تھے اور خوش ہوتے رہے تھے اور جب ہم سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف گئے تھے تو سائیں اور ان کا کتا خوش وخرم ٹیلے کی طرف چلے گئے تھے اس رات کے پچھلے پہر بھسین کے آسمان کو آگ لگ گئی تھی شمال میں اچھوگل کی طرف اور جنوب میں واہگہ کی طرف سے توپوں، ٹینکوں اور مشین گنوں نے آگ اگلنا شروع کر دیا تھا گاؤں کے اوپر سے آگ کے گولے اڑتے ہوئے جا رہے تھے آسمانوں کے ستارے اس آگ کے پیچھے کہیں نابود ہو گئے تھے اور لوگ آگ کی اس سرنگ میں زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے گاؤں کے درختوں اور باغوں میں سونے والے پرندوں کی فوجوں نے گاؤں پر اپنے پروں کی چادر تان دی تھی پرندوں کی فوجیں فضاء میں اور گاؤں کے لوگ مکانوں کی چھتوں پر نعرے لگا رہے تھے اور آگ کی سرنگ کا گھیر تنگ ہوتا جا رہا تھا اور اس گھیرے میں لوگ نعرے لگا رہے تھے، خندقیں کھود رہے تھے، دشمن کے مقابلہ کے لئے کلہاڑیوں کے پھل تیز کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈانگوں کو تیل لگا رہے تھے پاکستانی فوجوں کی کشمیر کے محاذ پر پیش قدمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی فوجیں لاہور کے محاذ پر نمودار ہو گئی تھیں اور بی آر بی کے ہمارے والی طرف پاکستانی فوج کا کوئی پتہ نشان نہیں تھا اور

لوگ بھارتی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے

سرخ خونی وردی چمکا کر جب سورج بھارتی فوجوں اور توپوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کو بیدار ہوا تو میں اور یونین کونسل کا سیکرٹری بنگالی ڈاکٹر کی خیریت لینے گئے نحیف و ناتواں ڈاکٹر مرہم پٹی اور ٹانکے توپے کی تیاریاں مکمل کر کے لڑائی میں شامل ہونے کو تیار بیٹھا تھا اور اس کی بیوی سائیں جیوا اور اس کے کتے کے لئے فکرمند ہو رہی تھی وہ دونوں ابھی تک ناشتہ کرنے نہیں آئے تھے ہم سائیں جیوا اور ان کے کتے کے لئے ناشتہ لے کر گئے تو ویرانے میں بنی اس اکیلی قبر کے پاؤں کے درختوں کے جھنڈ سے ملے آم کے باغ میں موروں کی فوجیں جمع ہو رہی تھیں ہر طرف سے اور ہر باغ سے لمبی لمبی اڑانیں بھرتے ہوئے اور تیز تیز دوڑتے ہوئے موروں کے قافلے اس باغ میں جمع ہو رہے تھے اور سائیں جیوا دیوانہ وار دوڑے پھر رہے تھے وہ زخمی موروں کو اٹھا اٹھا کر لا لا کر جوہڑ کے کنارے لٹا رہے تھے زخمی مور چیخ رہے تھے پھڑ پھڑا رہے تھے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر رہے تھے اور سائیں جیوا ان کے زخم صاف کر رہے تھے انہیں پانی پلا رہے تھے اور باغ میں دیوانہ وار دوڑے پھر رہے اور ان کا کتا ان کے ساتھ تھا۔

سائیں جیوا نے ناشتے کا دودھ مٹی کے دو پیالوں میں ڈال کر ایک پیالہ کتے کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا ایک زخمی مور کی چونچ سے لگا دیا مور نے آنکھ جھپک کر پیالے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اور پھر دونوں آنکھیں کبھی نہ کھولنے کے لئے بند کر لیں سائیں جیوا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ''ڈاکٹر جی یہ تو مرتے ہی جا رہے ہیں''۔

زخمی بہت تھے اور سائیں جیوا اکیلے تھے اور ڈاکٹر کے پاس زخمی موروں کی مرہم پٹی کا سامان نہیں تھا اور جوہڑ کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہت سے مردہ مور پڑے تھے اور باغ میں زخمی مور چیخ رہے تھے پھڑ پھڑا رہے تھے اور سائیں جیوا انہیں مرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور رو رہے تھے اور دوڑتے پھر رہے تھے۔

جنگ بندی کے دنوں میں بنگالی ڈاکٹر اور میں خصوصی اجازت پر بھسین کا احوال جاننے گئے تو اس پرانی قبر کے پاس جوہڑ کے کنارے ایک اور قبر بن گئی تھی سائیں جیوا نے سترہ روزہ جنگ میں مارے گئے سارے موروں کو ایک ہی گڑھے میں ڈال کر ان کی مشترکہ قبر بنا دی تھی اور وہ موروں کی اس مشترکہ قبر کے بھی مجاور بن گئے تھے ہر طرف توپوں اور ٹینکوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گولے بکھرے پڑے تھے آم کے باغ کا کوئی ایک بھی درخت سلامت نہیں تھا گولوں سے چھلنی ٹنڈ منڈ درخت سوکھ گئے تھے مر رہے تھے اور سائیں جیوا قبر کی چار دیواری کے سایہ میں خاموش بیٹھے تھے۔

ہسپتال اور ہائی اسکول میں پاک فوج تھی ویران کھلے میدان کے دوسری طرف ہندو اور سکھ فوجی چل پھر رہے تھے بھسین گاؤں میں بھی پاک فوج کے جوان اور افسر مقیم تھے اور گاؤں کے جوہڑ کی دوسری طرف ہندو سکھ تھے اور دونوں فوجوں کے درمیان بارودی سرنگیں بچھا دی گئی تھیں اور گاؤں کے کتے بارودی سرنگیں سونگھ سونگھ کر بھارتی فوجوں کی طرف آتے جاتے رہتے تھے دھرتی کا سینہ چھلنی ہو گیا تھا برباد مکانوں کے ملبہ میں گاؤں کی گلیوں اور بازاروں میں اور کھیتوں میں ہر طرف ہر کہیں توپوں اور ٹینکوں کے گولوں کی اور ان کے خولوں کی فصل لہلہا رہی تھی اور کتے بڑی آزادی سے گھومتے پھرتے رہتے تھے اور دونوں طرف سے کھا کھا کر بہت موٹے ہو گئے تھے۔

تاشقند میں معاہدہ کے بعد بھارتی فوجیں بھارتی سرحدوں کے پیچھے چلی گئیں اور جاتے ہوئے سارے باغ اور درخت کاٹ کر ساتھ لے گئیں جن دیہات، آبادیوں اور ڈیروں پر وہ قابض رہی تھیں وہاں کوئی درخت سلامت چھوڑا نہ مکان پختہ مکانوں کی دیواریں تو انہوں نے بنیادوں تک کھود ڈالی تھیں مکانوں کی چھتیں، کھڑکیاں، دروازے اور اینٹیں سب کچھ بھارت کے فوجی جاتے ہوئے ساتھ لے گئے تھے اور پاکستان کی حکومت جلد از جلد ان بستیوں کو آباد کرنا چاہتی تھی اور محکمہ مال کے حکام بڑی تیزی سے آبادکاری میں مصروف ہو گئے تھے اور اس آبادکاری کو اور بھی تیز کرنے کے لئے مال افسر اپنے سارے اختیارات اور عملہ کے ساتھ بھسین آئے ہوئے تھے اور جنگ زدگان کو ان کے نقصانات کا موقعہ پر نقد معاوضہ ادا کیا جا رہا تھا پٹواری، گرداور اور تحصیلدار بستی بستی گھوم کر نقصانات کے تخمینے تیار کرتے تھے اور متعلقہ نمبردار سے تصدیق کروا کر مال افسر فوری ادائیگی کر دیتے تھے اور جنگ زدگان ان سے بہت خوش تھے مگر سائیں جیوا ان سے بہت ناراض تھے اگر کسی کا دو کمروں کا گھر ہوتا تھا تو مال افسر صاحب اسے چار کمروں کا معاوضہ ادا کر دیتے تھے جس کے چار مویشی ضائع ہوئے تھے اسے آٹھ مویشیوں کی رقم مل رہی تھی اگر کسی بندے کے کلیم داخل کرنے سے پہلے ہی اس کے نقصانات کی نقد ادائیگی ہو چکی ہوتی تھی تو وہ اس سے نیا کلیم داخل کروا کر نمبردار سے تصدیق

کروا لیتے تھے اور اس کے نقصان کا بھی ازالہ کر دیتے تھے وہ بہت ہی نقصان دوست اور انسان دوست مال افسر تھے اور ہر کسی کو اس کے نقصان اور کام کا زر نقد ادا کر کے بڑی خوشی محسوس کرتے تھے اور سائیں جیوا کا جلال ان کے وجود پر غالب آ گیا تھا ''میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا'' وہ دھمکیاں دے رہے تھے۔

مال افسر اپنا بوریا بستر اور عملہ سمیٹ کر ہائی سکول سے گاؤں منتقل ہو گئے اور پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے انسانیت کے دکھ درد اور معاوضہ بانٹنے میں لگ گئے لوگ آتے تھے کلیم وصول کر کے جہاں کہیں ٹھکانہ مل گیا تھا واپس چلے جاتے تھے ادھر ان کے رہنے کو مکان نہیں تھے کھیتوں کے لئے پانی نہیں تھا بارودی سرنگوں اور گولوں کی فصل ابھی اٹھائی نہیں جا سکی تھی اور سارے علاقہ میں صرف مال افسر کا ڈیرہ ہی اس وقت تک آباد ہو سکا تھا

ایک صبح سائیں جیوا سکول کے کنویں کی منڈیر پر خاموش بیٹھے تھے میں نے سلام کیا انہوں نے گردن اٹھا کر دیکھے بن جواب دیا میں ان کے پاس منڈیر پر بیٹھا رہا اور وہ دور افق میں کچھ تلاش کرتے رہے اس طرف دیکھتے رہے جہاں کبھی آم کے باغ ہوتے تھے اور ان باغوں میں مور ناچتے ہوتے تھے اور جہاں اب ہر طرف بربادی اور ویرانی تھی ''سائیں جی کیا ڈھونڈ رہے ہو اس ویرانی میں'' میں نے بات شروع کرنا چاہی

وہ خاموش رہے۔

''سائیں جی لوگ تو کہتے ہیں مال افسر بہت نیک ہے آپ اس پر اتنے ناراض کیوں تھے؟''

''میرے بابا کو اس کی نیکیوں سے ظلم کی بدبو آتی تھی'' انہوں نے جواب دیا اور اٹھ کر چل دیئے میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا رہا انہیں موروں کی قبروں کی طرف جاتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ شاید سائیں جیوا تو اب مجھے پہچانتے ہی نہیں

گاؤں میں یونین کونسل کے سیکرٹری کا ڈیرہ بھی آباد ہونے لگا وہ اپنے ساتھ حکومت کی طرف سے دیا ایک ٹرانسسٹر بھی لائے تھے اور عصر کے بعد اس کا بٹن دبا کر اپنے ڈیرے پر بیٹھ جاتے تھے اور بارودی سرنگیں صاف کرنے والے فوجی جوان، گاؤں کا چوکیدار اور بھولے بھٹکے جنگ زدگان دائرہ بنا کر گرد بیٹھ جاتے تھے ریڈیو پر جنگ زدگان کی آبادکاری کی حکومت کی کوششوں کے بارے میں خصوصی پروگرام پیش کئے جاتے تھے اور سیکرٹری صاحب جنگ زدگان کو حکومت کی ان کوششوں سے آگاہ کرنے اور عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وہ پروگرام پہنچانے کا اپنا فرض منصبی ادا کرنے لگے تھے ایک سہ پہر ہم سیکرٹری صاحب کے ڈیرے پر بیٹھے اپنی بحالی کے پروگرام سن رہے تھے کہ سائیں جیوا بھی آ گئے سیکرٹری نے آہستہ سے کہا ''سائیں جیوا کے ساتھ تو اب ان کی لاٹھی ہی رہ گئی ہے''۔

سائیں جی خاموش بیٹھے جنگ زدگان کی بحالی کے پروگرام سنتے رہے ریڈیوں کا منہ بند کر کے سیکرٹری صاحب نے اپنے سامعین کو اپنی زبان سے حکومت کے جنگ زدگان کی بحالی کے پروگراموں سے آگاہ کرنا شروع کیا تو سائیں جی کھڑے ہو گئے ''میرے بابا کے موراب کہاں رہیں گے باغ تو وہ سب کاٹ گئے ہیں؟''

''سائیں جی کیا پتہ موراب آئیں گے بھی ادھر یا نہیں؟'' سیکرٹری نے جواب دیا

''مور آئیں گے ضرور آئیں گے مور تم بتاؤ ان کے لئے تم کیا کر رہے ہو؟'' سائیں جیوا کے سوال کا بوجھ بڑھ گیا

''سائیں جی آپ نے اپنا کتا کیوں مار دیا تھا؟'' سیکرٹری نے جواب سے بچنے کے لئے سائیں جیوا سے پوچھا

''اس کے خون میں میرے بابا کے دشمن کا نمک شامل ہو گیا تھا'' سائیں جیوا کی آنکھوں میں جلال جمع ہونے لگا

''اس نے تو اتنے سال آپ کا نمک کھایا تھا پھر بھی.....''

''ہاں پھر بھی کتے کا بچہ جو تھا'' سائیں نے اس کی بات کاٹ دی

☆☆☆☆☆

بیگم انا اللہ

شمسو سمگلر کا سر بہت چھوٹا تھا بھرپور سائز کے سندھڑی آم جیسا اس نے مونچھیں بڑی وزنی پال رکھی تھیں اور چھوٹے سر اور لمبی لمبی بھاری مونچھوں میں حسن توازن بحال رکھنے کو شمسو ہر وقت بڑا سا سفید پگڑ سر پر اٹھائے رکھتا تھا کرمُوں مراثی کا خیال تھا کہ شمسو رات کو سوتے وقت بھی سر سے پگڑ علیحدہ نہیں کرتا تھا تا کہ اس کی بیوی کو اس کے سر کے سائز کا راز نہ معلوم ہو جائے شمسو کا سر جس قدر چھوٹا تھا ان کی ''بیگم صاحبہ'' کا سر اسی قدر بڑا تھا اور جب وہ اپنے بڑے سے سر پر چھوٹا سا دوپٹہ جما کر کرسی پر سیدھی بیٹھتی تھیں اور اپنی انگریزی میں ہمارے گاؤں کی پنجابی ملا ملا کر شمسو سے گاؤں میں مرغی انڈوں کا نرخ اور علاقہ میں زمینوں کی قیمت کے بارے میں سوال پوچھتی تھیں تو کوئی مسٹر جسٹس قسم کی چیز معلوم ہوتی تھیں شمسو بیگم صاحبہ کے حضور بڑے ادب سے بیٹھا کرتا تھا اور بڑے سے پگڑ میں چھپا ہوا اپنا چھوٹا سا سر ہلا ہلا کر جواب دیا کرتا تھا وہ بیگم صاحبہ شمسو کی ذاتی بیگم نہیں تھیں کوئی شہری بیگم تھیں اور شمسو ہر بات ''ہماری بیگم صاحبہ'' سے شروع کر کے ''ہماری بیگم صاحبہ'' پر ختم کیا کرتا تھا اور کرمُو مراثی اسے شمسو کی بیگم صاحبہ کہا کرتا تھا بیگم صاحبہ جب بھی آتی تھیں گاؤں سے باہر شمسو کے ڈیرے پر بیٹھی انگریزی میں پنجابی ملا ملا کر سوال پوچھتی رہتی تھیں اور ان کی ساتھی دو تین لڑکیاں گاؤں میں گھوم پھر کر خواتین سے ان کے بچوں کی تعداد اور کسی ڈاکٹر کی مدد کے بغیر بچوں کو جنم دینے کا بھید معلوم کرنے میں لگی رہتی تھیں اور شمسو اپنی مونچھوں کو تاؤ دے دے کر گاؤں کے بوڑھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور بچوں کو ان کی نئی نئی کہانیاں بنا کر سناتا رہتا تھا اور گاؤں کے بچے بیگم صاحبہ کی گاڑی دیکھتے ہی ''شمسو کی بیگم آئی! شمسو کی بیگم آئی'' کا ترانہ شروع کر دیتے تھے

دسمبر کی کسی سرد چھٹی کے دن میں دھوپ کی تلاش میں گاؤں گیا تو شمسو کے ڈیرے پر بہت رونق تھی بچے بوڑھے اردگرد کے دیہات کے سمگلر بہت سے لوگ وہاں جمع تھے شمسو آلتی پالتی مارے پلنگ کے درمیان میں بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور لوگ اسے مبارک بادیں دے رہے تھے اور اپنے اٹوٹ انگ پگڑ کی جگہ شمسو نے سر پر چھوٹا سا دوپٹہ جمایا ہوا تھا اور اس کے سر اور مونچھوں کا توازن بہت بگڑ گیا تھا ''شمسو تم نے یہ دوپٹہ کس خوشی میں اوڑھ لیا ہے؟''

''ملک صاحب یہ بیگم صاحبہ کا دوپٹہ ہے انہوں نے اپنا دوپٹہ میرے سر پر رکھ دیا اور اپنی پگڑی میں نے بیگم صاحبہ کے سر پر باندھ دی ہے۔'' اس نے خوشی خوشی مجھے خوشخبری سنائی

میں نے پگڑی سے پگڑی بدلنے کا تو سنا تھا ہمارے علاقہ میں کئی سمگلر آپس میں پگ وٹ بھائی بنے ہوئے تھے لیکن کسی مرد کے کسی عورت کے دوپٹے سے پگڑی بدلنے کے بارے میں نہیں سنا تھا میں کچھ حیران سا ہو گیا شمسو نے اگر بیگم صاحبہ کو بہن بنانا ہی تھا تو وہ انہیں کوئی دوشالہ پہنا دیتا یہ پگڑی کے بدلے دوپٹہ اوڑھ لینا تو بڑی عجیب سی حرکت تھی مجھے پریشان دیکھ کر کرمو مراثی مسکرایا ''ملک جی اللہ ہی خیر کرے شمسو کی بیگم ایک رومال کے بدلے دس پندرہ دوپٹوں کا کپڑا اچرا لے گئی ہے۔''

شمسو کوئی بہت بڑا سمگلر نہیں تھا وہ عام سا سمگلر تھا اور اس قسم کے سمگلر سرحدی دیہات میں درجنوں میں پائے پائے جاتے تھے ایک زمانے میں جب لاہور میں قزلباش وزارت کرتا تھا تو سرحدی علاقوں کے تقریباً سارے ہی مرد سمگلنگ کیا کرتے تھے کچھ ضرورت کے تحت اور دوسرے مجبوری کے سبب سے شہر کے بڑے بڑے سمگلروں کا مال اٹھا کر وہ رات کے اندھیرے میں سرحد تک لے جاتے تھے اور ادھر کا مال اٹھا کر واپس لے آتے تھے اور سینہ تان کر چلنا شروع کر دیتے تھے اس زمانے میں جو اندھیری راتوں میں اس طرح کی سمگلنگ کے پھیرے نہیں لگاتا تھا تھانے کچہری میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی تھی اور گاؤں کا چوکیدار بھی اس کی بات پر توجہ نہیں دیتا تھا اس لئے اکثر لوگوں کو اپنی عزت بچانے کے لئے مجبوراً پھیرے لگانا پڑتے تھے پر شمسو عزت بچانے کے لئے نہیں عزت کمانے کے لئے پھیرے لگایا

کرتا تھا اور اس کمائی سے اس نے بھی گاؤں کے قبرستان کے قریب کچھ زمین خرید کر وہاں ڈیرا بنا لیا تھا اور سینہ تان کر چلنا شروع کر دیا تھا اور اپنے چھوٹے سے سر پر بڑا سا پگڑ باندھ لیا تھا اور اس وقت سے کبھی میں نے اسے پگڑ کے بغیر نہیں دیکھا تھا پر اس روز وہ پگڑ اتار کر اور دوپٹہ اوڑھ کر بہت خوش تھا کرمو گاؤں کا جدی پشتی مراثی تھا اسے سب کا شجرہ نسب زبانی یاد تھا اس لئے وہ کسی بڑے سے بڑے سمگلر کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کیا کرتا تھا اس نے شمسو کو سنانے کے لئے آواز اونچی کی ''ملک صاحب شمسو سے کہیں گھر دوپٹہ اتار کر جائے ایسا نہ ہو بیبیاں اسے شاہ دولے کا چوہا سمجھ کر اس کی جھولی روٹیوں سے بھر دیں''

شمسو نے سو سو روپے کے نوٹ ہوا میں لہرائے ''کرمو یہ لو بچوں کی مٹھائی کے لئے''

کرمو نے نوٹ پکڑ لئے اور ڈول ویل سمگلر بیگم کے نام کی ویل شمسو سمگلر کی طرف سے ویل پانچ سو روپے کی ویل'' کی ویل ہوک دی

شمسو کے پاس بیٹھے سب حاضرین اور اردگرد کھڑے ناظرین نے اس زور کا قہقہہ لگایا کہ ''سمگلر بیگم کے نام کی ویل'' کی لہروں پر سوار ہو کر قہقہہ گاؤں کی دیواروں سے جا ٹکرایا

کرمو نے سو سو روپے کے نوٹ جیب میں ڈالے شمسو کو سلام کیا اور تیز تیز چلتا ہوا واپس آ گیا ''ملک جی یہ نوٹ تو بہت بھاری ہیں مجھ سے تو ان کا وزن اٹھا کر چلا ہی نہیں جا رہا مجھے تو یہ رشوت کے نوٹ معلوم ہوتے ہیں آپ مجھے گاڑی میں بٹھا لیں تو میرے بچے آپ کو بھی دعائیں دیں گے''

''رشوت کے ہی تو ہیں یہ نوٹ شمسو نے تمہارا منہ بند کرنے کو تمہیں رشوت ہی تو دی ہے'' میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا

کرموں نے قہقہہ لگایا ''ملک جی مجھے اس رشوت کی اتنی خوشی نہیں جتنا مجھے شمسو کی پگڑی کا دکھ ہے مجھے تو یہ سودا کچھ اچھا نہیں دکھتا''

میرا گاؤں کبھی کبھار ہی جانا ہوتا تھا اور واپس آ کر میں گاؤں کی چھوٹی موٹی خبروں خوشیوں اور دکھوں کو زیادہ دیر تک دماغ کے یادداشت کے خانے میں محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا شمسو سمگلر کی بیگم اور شمسو کو دوپٹہ بدل بھائی بنانے کا واقعہ بھی میں بھول چکا تھا کہ ایک دوپہر ملازم نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اطلاع دی ''ایک سمگلر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''سمگلر؟ مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟ کون سمگلر؟''

''جی انہوں نے اپنا نام سمگلر ہی بتایا ہے۔''

میں اپنے علاقہ کے کسی سمگلر سے اتنا بے تکلف نہیں تھا کہ وہ اپنا نام نہ بتائے اور میں صرف سمگلر سے اسے پہچان جاؤں اور نہ ہی علاقہ کے کسی چھوٹے بڑے سمگلر میں اتنی جرات تھی کہ وہ میرے ساتھ اتنی بے تکلفی سے کام لے ایسا کون ہوسکتا ہے؟ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا مگر کسی کی شکل سامنے نہ آئی ''اس کا نام پوچھ کر بتاؤ اور یہ بھی کہ اسے مجھ سے کیا کام ہے''

ملازم نے واپس آ کر ''شمس دین سمگلر'' کی چٹ میرے سامنے رکھی تو مجھے کرمُوں کی بات یاد آ گئی ''ملک جی مجھے تو یہ سودا کچھ اچھا نہیں لگا'' شمسو کبھی میرے دفتر نہیں آیا تھا آج کیوں آیا ہے؟ بیگم سے بہن چارے میں کوئی مشکل تو پیدا نہیں ہوگئی؟ لیکن شمسو کے چہرے پر تو چنبیلی کے موسم بہار کی سی رونق تھی صاف ستھرا لباس سر پر مایہ لگا بڑا سا پگڑ اکڑی ہوئی مونچھیں نیا بناخط ''میں نے کہا ملک صاحب کا دفتر بھی دیکھتا جاؤں میں بیگم صاحبہ کو مبارکباد دینے آیا تھا ان کے صاحب بڑے جج ہو گئے ہیں بیگم صاحبہ کا ڈرائیور مجھے چھوڑ گیا ہے یہاں آپ نے تو کبھی اپنا دفتر دکھایا ہی نہیں تھا بیگم صاحبہ ٹھیک ہی کہتی تھیں ڈرائیور نہ ہوتا تو میں آپ کا دفتر ڈھونڈ ہی نہیں سکتا تھا'' اس نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ بتا دیا

میں شمسو کی خوشی سمجھ رہا تھا سمگلر لوگوں کے لئے تو چھوٹا موٹا عدالتی اہلکار ہی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے اور اس کی بیگم کا صاحب کوئی بڑا جج ہوگیا تھا اس سے واقعی سرحدی دیہات میں اس کا مرتبہ بلند ہوگیا تھا اور اس کے لئے اپنے اس مرتبہ سے مجھے بھی آگاہ کرنا ضروری تھا

''تم بھی تو بیگم کا دوپٹہ اوڑھ کر جج ہی دکھتے تھے تم نے وہ دوپٹہ اتار کیوں دیا ہے؟'' میں نے مذاقاً پوچھا

اس نے قہقہہ لگایا ''ملک صاحب اللہ نے کرم کیا ہے بیگم صاحبہ کے صاحب بڑے جج بن گئے ہیں اب مجھے دوپٹہ جج بننے کی کیا ضرورت ہے؟''

شمسو بار بار اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اس نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا

''یہ دیکھیں ملک جی بیگم صاحبہ نے زبردستی باندھ دی ہیں میں نے بہت کہا کہ مجھے تو کبھی سر درد بھی نہیں ہوا پر وہ مانتی ہی نہیں تھیں زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال لے گئیں دس پندرہ ڈاکٹروں نے ٹوٹیاں لگا لگا کر دیکھا کسی کو کچھ نہیں ملا پھر بھی یہ اتنی ساری دوائیاں باندھ دی ہیں

اور ایک دھیلا نہیں لیا مجھ سے نہ دوائیوں کا نہ ٹوٹیوں کا وہ سارے ڈاکٹر بیگم صاحبہ کے اپنے ملازم ہی ہیں ان کا ہسپتال دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا ملک جی اللہ نے کیسے کیسے نیک بندے پیدا کئے ہیں''

''ہاں شمسو یہ دنیا اللہ کے ایسے نیک بندوں سے کبھی خالی نہیں رہی''

بیگم کون ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟ میں نے کوئی دلچسپی نہ لی تو شمسو کو حیرانی سی ہوئی

میں جب بھی کبھی کبھار گاؤں جاتا تھا کرمُوں مراثی رپورٹ دیتا تھا کہ بیگم صاحبہ کی وجہ سے علاقہ میں اور سمگلر لوگوں میں شمسو کا مرتبہ بہت بڑھ گیا ہے اور وہ ہر محفل میں بیگم صاحبہ کی گاڑیوں اور ملازموں کی مردم شماری کرتا رہتا ہے کبھی بیگم صاحبہ اور ان کے جج صاحب کے بیرونی ممالک کے سیر سپاٹوں کی کہانیاں سناتا ہے ایک دو دفعہ تو بیگم صاحبہ اسے اپنے ساتھ اسلام آباد بھی لے گئی تھیں پر مجھے کرمُوں کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنا خاندانی فرض پورا کرنے کے لئے ہر بار مجھے پوری رپورٹ دے کر خوشی محسوس کرتا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی رپورٹ پر خوشی کا اظہار کر دیا کرتا تھا

ایک بار تین ایک سال بعد میں گاؤں گیا کرمُوں کی رپورٹ ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ شمسو بھی آ گیا وہ پہلے سے بھی زیادہ سینہ تان کر چلنے لگا تھا ''ملک صاحب مبارک ہو بیگم صاحبہ نے آپ کے گاؤں کے غریبوں کے لئے ہسپتال بنوا دیا ہے یہاں وہ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ ڈاکٹر بھیجیں گی اور تنخواہیں بھی اپنے پاس سے دیں گی کسی کو دوائی کا بھی کچھ نہیں دینا پڑے گا سب کچھ مفت ہوگا''

کرمُوں بتا چکا تھا کہ قبرستان کے قریب شمسو کی نگرانی میں ایک نئی عمارت مکمل ہوگئی ہے اور بیگم صاحبہ نے وہ عمارت ہسپتال کے لئے بنوائی ہے لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ زمین شمسو نے مفت دی ہے۔ ''ملک صاحب میں نے کہا بیگم صاحبہ اتنا کچھ کر رہی ہیں تو تھوڑا سا حصہ میں بھی ڈال دوں مجھے تو زمین کی قیمت لیتے ہوئے شرم آتی تھی بندہ جس کے سر پر اپنی پگڑی رکھ چکا ہو اس سے پیسے لینا مردوں والی بات نہیں تھی۔''

شمسو کی درخواست پر ہسپتال کے لئے بنائی عمارت دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی ایک ہی لائن میں بارہ ضرب چودہ فٹ کے تین کمرے اور سامنے آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ برآمدے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا کمرہ تھا فرش اینٹوں کے تھے اور مشین سے رگڑائی کر کے گاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے راج کی خامیاں ہموار کر دی تھیں کمروں کے اندر کی طرف دیواروں پر ہلکا سبز رنگ ملا کر سفیدی کی تھی اور باہر ٹھوکویں ٹیپ کر کے سرخ رنگ کر دیا تھا دروازے اور کھڑکیاں لوہے کی موٹی چادر سے بنے تھے ہمارے گاؤں کے مکانوں کی نسبت ہسپتال کی عمارت کافی مضبوط اور خوبصورت تھی

ہمارا گاؤں لاہور سے نہ زیادہ دور ہے اور نہ ہی بہت قریب ہے پر اس قربت کے باوجود ہمارے علاقہ میں بھارت کی سرحد تک کسی گاؤں میں کمپوڈر بھی دستیاب نہیں ہوتا تھا ہسپتال کی عمارت دیکھ کر اور شمسو سے بیگم صاحبہ کے منصوبے جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی میرے دل میں رات کو پھیرے لگانے والے شمسو کے لئے احترام جڑیں پکڑنے لگا شمسو نے جو زمین ہسپتال کے لئے دی تھی وہ گاؤں سے قریب ہی تھی اور گاؤں کی آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے اسے اس کی بھاری رقم مل سکتی تھی میں نے اس کی قربانی کو سراہا تو اس نے سر جھکا دیا

''ملک صاحب یہ سب بیگم صاحبہ کی وجہ سے ہے''

ہسپتال کی افتتاحی تقریب میں شمسو نے کرموں کو بھیج کر مجھے شہر سے بلوایا تھا اردگرد کے دیہات کے سب سمگلر اور معززین بھی آئے تھے ایک مرد اور ایک خاتون ڈاکٹر دو نرسیں ایک کلرک ایک چوکیدار اور دوائیوں کے بہت سے ڈبے بیگم صاحبہ بہت کچھ ساتھ لائی تھیں شمسو اپنے چھوٹے سے سر پر بہت بڑی پگڑی سجائے سٹیج پر بیگم صاحبہ کے پہلو میں بیٹھا تھا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں بہت چمک آ گئی تھی وہ دن ہمارے گاؤں اور شمسو سمگلر کی زندگی میں ایک یادگار دن تھا جب چاندی کی پلیٹ سے چمکدار قینچی اٹھا کر شمسو نے ہسپتال چالو کرنے کا فیتہ کاٹا تو ہم سب نے بہت تالیاں بجائیں بیگم صاحبہ نے شمسو کے لوگوں کی خدمت کے جذبہ کی تعریف کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ بہت خوشی کا دن تھا گاؤں کے بچے سفید وردیوں والے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بڑی حیرانی اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور ہم شمسو سمگلر اور اس کی پگ وٹ بہن کے اس عظیم کارنامے پر اپنے اپنے دل صاف کرنے میں لگ گئے تھے اور شمسو نے سب شرکاء کی خوب سیوا کی تھی

بیگم صاحبہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کی بہت خدمت کر رہی تھیں علاقہ میں بچیوں کی تعلیم کا کوئی سکول نہیں تھا بیگم صاحبہ نے اس کا بھی بندوبست کر دیا شمسو کی زمین پر ہسپتال کے قریب ہی سکول کی عمارت بنوا دی اور بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا رات کے

اندھیرے میں بارڈر کے پھیرے لگانے والے سب شرمسار رہنے لگے تھے کہ جو کام کبھی ان کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا وہ شمسو اور اس کی بیگم صاحبہ نے کر دکھایا تھا اردگرد کے دیہات سے بھی بچیاں سکول آنے لگی تھیں اور غریب غرباء کا مفت علاج ہونے لگا تھا اور شمسو سارے علاقے میں ملک شمس دین مشہور ہو گیا تھا اور میں اس پر حسد کرنے لگا تھا

جون کے ایک سخت گرم دن کی دوپہر ابھی ڈھلی نہیں تھی کہ شمسو میرے دفتر آیا وہ بہت مرجھایا ہوا تھا ملازم نے پانی کا گلاس سامنے رکھا وہ خاموش بیٹھا رہا اس کی مونچھیں نیچے کو ڈھلک گئی تھیں چھوٹا سا سر ننگا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی ''شمسو خیریت تو ہے گاؤں میں''

''ملک صاحب وہ بیگم صاحبہ کے میاں ہوتے تھے نہ جج صاحب.....'' لفظ شمسو کے لبوں سے جدا نہیں ہو رہے تھے

''انا للہ وانا الیہ راجعون کب؟''

''وہ کچھ اور بھی بہت بڑے ہو گئے ہیں'' شمسو نے رک رک کر بات مکمل کی

میں نے شرمندگی کو چھپانے کو جلدی سے کہا ''مبارک ہو یہ تو بہت اچھی خبر ہے''

''انا للہ والی خبر ہی ہے ملک صاحب آپ نے انا للہ ٹھیک ہی پڑھا ہے''

''بیگم صاحبہ تو ٹھیک ہیں؟'' مجھے اس کی پہیلی سمجھ نہیں آ رہی تھی

''جی بالکل ٹھیک ہیں کل ہی امریکہ سے واپس آئی ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون''

''بیگم صاحبہ کے اور جج صاحب کے آپس میں تعلقات خراب تو نہیں ہو گئے؟''

''جی نہیں بالکل ٹھیک ہیں ان کے آپس کے تعلقات انا للہ وانا الیہ راجعون''

میری ہنسی نکل گئی ''شمسو انا للہ وانا الیہ راجعون پھر معاملہ کیا ہے؟''

''وہ میری پگڑی ہوتی تھی نا ملک صاحب وہ انا للہ ہو گئی ہے'' شمسو کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے اور میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے الفاظ ہونٹوں سے الگ نہیں ہو رہے تھے

''ملک صاحب وہ سکول اور ہسپتال بند ہو گئے ہیں''

''کیوں بند کیسے ہو گئے ہیں؟'' خبر واقعی پریشانی والی تھی

''ہسپتال تو کبھی کبھی کھلتا ہے بیگم صاحبہ کے شہر والے ہسپتال سے ایک ڈاکٹر صاحب مہینے میں ایک دو دفعہ لال دوائی کے ڈرم لے کر آتے ہیں اور مویشیوں اور انسانوں کو اسی ایک ڈرم سے دوائی دے آتے ہیں پر وہ سکول کافی عرصہ سے انا للہ وانا الیہ راجعون ہو چکا ہے''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیگم صاحبہ نہیں آتی کبھی اب؟''

''آتی ہیں اپنی کھمبیاں اور زمینیں دیکھنے کو''

''کھمبیاں؟ کیسی کھمبیاں؟''

''سکول کی عمارت خالی جو تھی بیگم صاحبہ نے وہاں کھمبیاں کاشت کروائی ہیں اور ان کا ایک ملازم اور دو کلاشنکوف والے محافظ ان کھمبیوں کی اور ان کی زمینوں کی ہم سمگلروں اور قبرستان کے مردوں سے حفاظت کرتے ہیں بیگم صاحبہ نے قبرستان کی بہت سی زمین پر بھی قبضہ کرلیا ہے اور چار دیواری بنوالی ہے اس کے گرد اس لئے انہیں قبرستان کے مردوں سے بھی شدید خطرہ ہے''

''مگر وہ سکول والی زمین تو تمہاری تھی؟ تم نے بیگم صاحبہ سے بات نہیں کی؟''

''میں نے کی تھی بات عدالت میں پر عدالت نے بتایا ہے کہ وہ زمین تو کسی..... سوسائٹی کی ہے''

''اس کا مطلب ہے.....''

''زمین اور جج کو گولی ماریں ملک صاحب مجھے تو اپنی پگڑی کا دکھ ہے بیگم انا للہ نے تو میری پگڑی کا بھی سوتنا بنالیا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون'' شمسو نے میری بات کاٹ دی

☆☆☆☆☆

ہتھیار

پھر ایسے ہوا کہ میرے لئے اپنے وجود میں واپس آنا دشوار ہوگیا میں اور میرا وجود آپس کی جدائی کے درد میں تڑپ رہے تھے میں نے اپنے وجود کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھا ہوا تھا میرا وجود کوئی دم پڑھ پڑھ کر میرے چہرے پر پھونکیں مار رہا تھا اور اس کا درد اور تڑپ میرے خون کی گردش میں شامل ہونے لگے تھے میں اور میرا وجود آپس کی جدائی کے درد میں تڑپ رہے تھے اور وہ اپنا کٹا ہوا بازو میری آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا

میں سال کے پورے گیارہ ماہ سخت چٹانوں سے رزق کی نہر نکالنے کو تیشہ چلاتا ہوں اگر چٹانوں پر تیشے کی ضرب سے سوچ کی کوئی چنگاری ہاتھ لگ جائے تو میں اسے اپنی زنبیل میں دبالیتا ہوں بارھواں مہینہ شروع ہوتے ہی میں زنبیل اٹھا کر اس وادی میں آجاتا ہوں اور راتوں کو جب وادی خاموشی کا لحاف اوڑھ کر سو جاتی ہے تو میں زنبیل کھول کر منتشر فکر کے موتی پرونے میں جت جاتا ہوں اس رات بھی وادی سو رہی تھی اور میں جاگ رہا تھا اور میرا قلم سوچ سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تہہ در تہہ خاموشی کا سینہ چیرتا ہوا گانے کا بول آیا اور مجھے اور میری سوچ کا سینہ چیر کر نکل گیا اور میرا قلم ہاتھ سے گر گیا گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر ایک دوسری سے گلے مل رہی تھیں بڑی سوئی کے ایک اور چکر مکمل کرنے تک مجھے پریشان سوچ کے بہت سے بکھرے بکھرے موتی ایک لڑی میں پرونا تھے اور میرا قلم گر گیا تھا اور گھڑی کی سوئیاں میرے پروگرام سے بے نیاز دوڑی جا رہی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت ہمیشہ سے بے نیاز رہا ہے شاید اسی لئے اب تک وہ وقت ہی ہے مجھے اس کی بے نیازی پر بہت غصہ آیا اس پر تو کسی درد بھرے گیت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا یہ آنکھیں بند کر کے روز اول سے ایک ہی خط مستقیم میں دوڑا جا رہا ہے یا شاید دیوار پر لٹکی گھڑی کی سوئیوں کی مانند گول دائرے میں چکر لگا رہا ہے ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا تیسرے کے بعد چوتھا چکر چکر ہی چکر کولہو کے بیل کی مانند وقت کے اس رواں دواں کولہو میں پس کون رہا ہے اور اس کی ٹوٹنی سے تیل کس کا نکل رہا ہے وقت نے کبھی بھی اس کی پرواہ نہیں کی میرا دل چاہتا تھا میں اس کی کنڈی دبا دوں

میں باہر کھلی ہوا میں نکل آیا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں اجنبی اجنبی سی خوشبو بسی ہوئی تھی اردگرد کے سارے اونچے اونچے پہاڑوں نے اپنے سارے سروں پر ایک ہی نیلی چادر تانی ہوئی تھی جس میں ہزاروں لاکھ بلب جھلمل جھلمل چمک رہے تھے آسمانوں کا سیاح مشرقی طرف کی ایک چوٹی سے ٹکرا کر دولخت ہو گیا تھا بڑا ٹکڑا کسی کھائی میں گر گیا تھا اور چھوٹا ٹکڑا اپنے محور سے باہر نکل آیا تھا مگر اسے وقت سے پیچھے رہ جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا کوئی بندہ ہو یا قوم ہو یا کوئی چاند کا ٹکڑا جو بھی کوئی اپنے محور سے نکل جائے وہ وقت سے پیچھے رہ جاتا ہے اور میں وقت کے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن گیت نے میرے دل پر کنڈی ڈال لی تھی میں گیت کے درد میں ڈوبا اس کی طرف چلتا گیا

میری کٹیا کے چھوٹے سے صحن کی چھوٹی سی دیوار کے اس پار کھلے میدان کے ایک کونے میں اندھیرے اجالے کی چادریں اوڑھے کچھ انسانی صورتیں تالیاں بجا رہی تھیں اور ان کے درمیان سے کسی انسانی وجود سے سرمست گیت کا پھوارہ پھوٹ رہا تھا وہ تالیاں بجاتے رہے میں چلتا رہا اور گانے والا گاتا رہا میں ان کی مست خوشی میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا تھا ایک چھوٹے سے درخت کی چھاؤں میں دم سادھ کر کھڑا ہو گیا ہوا جھوم رہی تھی اور درخت جھوم رہا تھا میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا تو گانے والے نے اپنے کان سے ہاتھ اٹھا لیا اور تالیاں رک گئیں شاید انہوں نے میرے سر کے جھٹکوں کا شور سن لیا تھا میں اپنے وجود میں واپس آ گیا مگر مجھے تالیوں کی موت کا بہت دکھ تھا مجھے شرم سی محسوس ہونے لگی تھی وہ سب میری طرف دوڑے میں اپنے کو سزا کے لئے تیار کر رہا تھا کہ گانے والا دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا

''سر آپ؟''

''تم؟''

مجھے شدید سردی محسوس ہونے لگی میں نے جسے دونوں بازوؤں سمیت وداع کیا تھا وہ ایک ہی باز سے مجھے سے لپٹا ہوا تھا اور ایک بیساکھی والا تالیاں بجا رہا تھا اور ان کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے اور میں اپنے وجود سے جدا ہو گیا تھا۔ شہر کی نئی کالونی میں جب میں نے نیا گھر بنوانا شروع کیا تو ایک صبح پرانے مزدوروں کے ساتھ ایک نیا مزدور آیا تھا اٹھارہ بیس کی عمر گورا چٹا رنگ تیز دھاری نقوش لمبی ناک بادامی آنکھیں اور پراعتماد چال وہ پاؤں اٹھاتا تو محسوس ہوتا زمین خود آگے بڑھ کر اس کے پاؤں تھام لیتی ہے میں نے اسے بھی کام دے دیا وہ اپنے ساتھیوں کی مانند کام چور نہیں تھا حیلہ ساز اور بہانہ باز بھی نہیں تھا ہر کام ایسی لگن سے کرتا تھا جیسے مزدوری نہیں عبادت کر رہا ہو میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا کچھ سوچ کر میں نے اسے ایک دن کی پیشگی اجرت دینا چاہی تو اس نے حیرانی سے دیکھا ''پسینہ خشک ہونے سے پہلے تو مزدوری ٹھیک پر پسینہ آنے سے پہلے نہیں'' اس نے شکریہ ادا کیا اور چلا گیا

وہ دوسرے روز بھی آیا اور جب تک مکان بنتا رہا آتا رہا اس کی لگن میں کبھی کوئی فرق نہ آیا وہ کام ایسے کرتا تھا جیسے اپنا ہی کام کر رہا ہو گھر مکمل ہو جائے تو نئے نئے مسائل اگنا شروع ہو جاتے ہیں پہلے مسئلہ یہ ہوا کہ جب تک اس میں منتقل نہیں ہوتے گھر کی نگرانی کون کرے گا؟ نگاہ انتخاب افضل خان پر آ کر رک گئی وہ بھی بخوشی تیار ہو گیا اور بوریا بستر لے آیا بستر تو خیر بستر ہی تھا قابل برداشت سا اور بوریا میں کپڑوں کے ایک جوڑے چند برتنوں اور ایک بانسری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا تھوڑے ہی دنوں میں اردگرد کے مکانوں کے چوکیدار اور مزدور سب اس کے مرید ہو گئے سب پر اس کی بانسری کا جادو چل گیا تھا اور بعض دفعہ مجھے اس کی چودھراہٹ بہت کھلتی تھی پھر سوچتا ایک چوکیدار کی تنخواہ میں اتنے سارے چوکیدار اسی کی وجہ سے تو مل رہے ہیں پر افضل خان کے گانے کا مجھے دوسرے مزدوروں سے بھی کبھی علم نہیں ہوا تھا۔

نئے مکان کی ضروریات بھی اکثر نئی ہوتی ہیں دیواروں کے رنگ کے خیر خواہ پردے کمروں کے سائز میں بچتا فرنیچر مکان کی وسعت اور نئی ضروریات کے مطابق ملازم مکان میں منتقل ہونے کے بعد بھی میں اسے چھٹی نہ دے سکا اور پھر میری ضرورت سے زیادہ اپنی لگن سے وہ چوکیدار سے منیجر بن گیا اس نے آہستہ آہستہ بہت سے کام خود ہی اپنے ذمہ لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لئے کس دن سبزی کتنے کی آئی پٹرول کتنا خرچ ہوا بچوں کو سکول لے جانے والا کب آئے گا کون ملازم کب چھٹی کرے گا سب بوجھ اس نے اٹھالیا ''میں فارغ ہی تو ہوتا ہوں بیٹھے رہنے سے مصروف رہنا بہتر ہے آپ کی مہربانی ہے جو آپ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں''

ایک دن میرا بیٹا گھر میں مٹھائی بانٹ رہا تھا'' میں نے آج سکول میں تقریری مقابلہ جیتا ہے؟''

''تقریر کس کی لکھی پڑھی تھی؟''

''بھائی افضل نے لکھ کر دی تھی''

''اور مٹھائی؟''

''یہ بھی بھائی افضل لایا ہے''

میں تھوڑا سا پشیمان اور حیران ہوا یہ لڑکا مزدوری کر سکتا ہے چوکیداری کر لیتا ہے، ملازمین کے معاملات چلا لیتا ہے اول آنے والی تقریر لکھ سکتا ہے اور پھر اپنی جیب سے مٹھائی منگوا کر تقسیم کر رہا ہے یہ ہے کیا چیز؟ میں نے مٹھائی کے پیسے دینا چاہے تو وہ مسکرایا'' آپ فرض کریں یہ میرا چھوٹا بھائی ہے تو اس کی جیت پر مٹھائی بانٹنا میرا حق نہیں؟ آپ مجھے میرے اس حق سے محروم نہ کریں۔''

اب وہ ہمارے گھر کا ہی ایک فرد تھا ہم نے نہیں بنایا تھا اس کے رویہ نے ہمیں مجبور کر دیا تھا وہ رات کو بچوں کو سکول کا کام بھی کرواتا تھا اور خود بھی کافی دیر تک پڑھتا رہتا تھا اور چوکیداروں اور مزدوروں سے میل ملاپ میں بھی جھول نہیں آنے دیتا تھا اس کا گاؤں کون سا ہے والد کیا کرتا ہے کتنے بہن بھائی ہیں اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا میں بھی پوچھنے کے بارے میں سوچتا ہی رہا تھا اور پھر ایک دن اس نے مستقل چھٹی کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا'' میں آج ہی جانا چاہتا ہوں ایمرجنسی ہے''

مجھے اس کے فیصلے سے دکھ ہوا تھا اس کے لئے نہیں اپنے کاموں کے لئے جو اس نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے انسان ہمیشہ اپنے مطلب کے لئے دکھی اور خوش ہوتا ہے اس نے واپس آنے کا وعدہ بھی نہیں کیا تھا اور اپنے گھر کا کوئی ایڈریس بھی نہیں چھوڑ گیا تھا اور میں نے اسے دونوں سلامت بازوؤں کے ساتھ وداع کیا تھا اور اسے اس حالت میں ایک ہی بازو سے اپنے سے لپٹا ہوا پا کر میں اپنے وجود کو اجنبی اجنبی سا محسوس کرنے لگا تھا اور افضل خاں مسکرا رہا

تھا اور بیساکھی والا بوڑھا پاس کھڑا قہقہے لگا رہا تھا

مجھے گرم موسم سے سخت نفرت ہے گرمی گرمی اور مزید گرمی نہ دن کو آرام نہ رات کو چین میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس بغداد والے نے الف لیلیٰ کیسے لکھ ماری تھی میں تو گرم دنوں میں کسی دوست کے خط کا جواب نہیں لکھ سکتا اور گرمی شروع ہوتے ہی اپنی زنبیل اٹھا کر اس وادی میں پہنچ جاتا ہوں اور کوئی جھونپڑی کرایہ پر لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور حسن فطرت کی ٹھنڈی ٹھار گود میں بیٹھ کر اپنی ب لیلیٰ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اس رات پہلے گیت کے بول میری سوچ اور پروگرام کے تانے بانے توڑ پھوڑ گئے پھر افضل کا ایک بازو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا بیساکھی والا بوڑھا قہقہے لگانے لگا تو مجھے اپنا وجود پرایا پرایا سا محسوس ہونے لگا

اس بیساکھی والے بوڑھے سے بھی میری اس وادی میں آشنائی کا نیہہ پتھر رکھا گیا تھا مگر اس بنیاد پر واقفیت کی دیواریں ابھی مکمل نہیں ہوئی تھیں ایک سہ پہر میں سیر کرتا کرتا دور نکل گیا اس طرف جہاں وادی کے باسی خاموشی کی سلطنت میں قدم رکھنا گناہ سمجھتے تھے سورج اونچے پہاڑوں کے پیچھے سے چھپ چھپ کر جھانک رہا تھا وادی میں سے پھلتی ہوئی بہنے والی ندی مدھم مدھم سروں میں کوئی نغمہ چھیڑ رہی تھی میرے دل کے تار پھڑکنا شروع ہو گئے میں ندی سے ہم کلام ہونے کو بلندی سے نیچے پہنچا تو پتھر پر بیٹھے ایک شخص کو دیکھ کر مجھے دکھ سا محسوس ہوا ایسے محسوس ہوا جیسے اس نے میری خلوت میں مداخلت کی ہو آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس کے قریب پہنچ گیا تو بھی اس نے گردن اٹھانے اور گھمانے کی ضرورت محسوس نہ کی میں اس کے پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا وہ لہروں میں کچھ تلاش کرتا رہا اندھیرا نا آشنا ہونے لگا تو میں اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر واپس آ گیا تھا

پھر میری اس سے اسی پتھر پر ملاقات ہونے لگی میں اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ ایک ایک کر کے ندی میں چھوٹے چھوٹے پتھر پھینکتا رہتا میں نے آشنائی کی دیوار اٹھانا چاہی اس نے کبھی حوصلہ افزائی نہ کی اندھیرا نا آشنا ہونے لگتا تو میں اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر آ جاتا ایک شام جب ندی پر اڑنے والے چھوٹے چھوٹے سیاہ پرندے پتھریلی دیواروں میں بنے اپنے اپنے سوراخوں میں گھسنا شروع ہو گئے تو میں نے آشنائی کی بنیاد پر پہلا وار رکھنے کی ایک بار پھر کوشش کی'' ان پرندوں سے آپ کی تو دوستی ہو گئی ہو گی''

''پردیسی سے کون دوستی کرتا ہے'' اس نے سارے پتھر ایک ہی بار پانی میں پھینک کر جواب دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا

مجھے تب معلوم ہوا کہ اس کی ایک ہی ٹانگ ہے

''جن کے گھر محفوظ ہوں اور کوئی دشمن ان کی آزادی نہ چھین سکے وہ کیوں کسی پردیسی سے دوستی کریں گے'' اس نے اپنا اکلوتا پاؤں جوتے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

میں نے سوچا شاید اسے میری بات یا مداخلت پسند نہیں آئی وہ اپنا اکلوتا پاؤں اور بیساکھی اونچی نیچی پتھریلی زمین پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا ''معاف کرنا میں نے آپ کو تکلیف دی'' میں نے معذرت کی

''ان پرندوں کے گھر محفوظ ہیں اونچے پہاڑوں میں بنے ان سوراخوں تک کوئی دشمن نہیں پہنچ سکتا اونچے پہاڑوں کے درمیان کی حسین وادیوں اور خاموش ندیوں پر وہی پرندے آزادی سے اڑ پھر سکتے ہیں جن کے گھروں تک کوئی شکاری نہ پہنچ سکتا ہو یہ مجھ سے کیوں دوستی کریں گے؟ ان کے گھر محفوظ ہیں ان کی وادیاں آزاد ہیں ان میں سے کبھی کسی نے کسی شکاری کو ان گھروں اور وادیوں کا راستہ نہیں دکھایا اور میرے گھر اور میری وادی پر میرے دشمن کا قبضہ ہے'' وہ اونچی نیچی پتھریلی زمین پر اپنا اکلوتا پاؤں اور بیساکھی جما جما کر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اور میرے سوال کے جواب میں جیسے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا

مجھے اپنے آپ سے باتیں کرنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے اپنے آپ سے باتیں کرنا زبان کا غلط استعمال ہے زبان تو دوسروں سے باتیں کرنے کے لئے ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا مجھے اس پر اور اپنے آپ پر غصہ آنے لگا میں اپنی معذرت واپس لینا چاہتا تھا لیکن وہ بھی اندھیرے میں کہیں گم ہو گئی تھی

ایک دن میں بستی کے اکلوتے چائے خانے میں بیٹھا تھا کہ وہ بیساکھی ٹیکتا ہوا تین چار ہمجولیوں کے ساتھ چائے کے چھپر میں داخل ہوا اور چائے کا آرڈر ہوک کرکو نے والی میز پر خوش گپیوں میں مصروف ہو گیا میرا خیال تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں یا اگر دیکھ لیا ہے تو اس شام کی ناراضگی کی انفیکشن ابھی تک اس کے ذہن سے دور نہیں ہو سکی چائے آئی تو وہ اٹھا بیساکھی ایک ہاتھ میں لی دوسرے ہاتھ میں چائے کا کپ اٹھایا اور میری میز پر پہنچ گیا ''یہ قبول کیجئے۔''

میں عقل اور چائے کے زیادہ استعمال کے خلاف ہوں اس سے انسان کا دماغ اور

جسم مریض ہو جاتے ہیں مگر اس کے خلوص اور بیساکھی کی وجہ سے انکار نہ کر سکا اس کی طرف سے چائے پیش کرنے کا مطلب تھا کہ تکلف برطرف بات ہو سکتی ہے اور ہوتی رہے گی اس کے بعد ہم نے کئی دفعہ ایک ہی میز پر بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پی اور بہت سی باتیں کیں اونچے پہاڑوں کے سوراخوں میں رہنے والے آزاد پرندوں کی اور اس کی اپنی وادی کی جو ایک دن موت کی وادی بن گئی تھی اور اس پر اتنی آگ اور بارود برسے تھے کہ درخت پھول پتے اور انسان جل کر راکھ ہو گئے تھے اور اس کی بیوی بچے ماں اور بہن بھائی بھی راکھ ہو گئے تھے مگر وہ اپنی وادی کے حسن اور موت کی کہانی اپنے خاندان کے راکھ ہو جانے کی کہانی ایسے سنایا کرتا تھا جیسے کسی اور کی کہانی سنا رہا ہو ''اور آپ کی ٹانگ'' ایک دن میں نے بے خیالی میں پوچھ لیا

وہ خاموش ہو گیا میری نظروں میں نظریں ڈال کر دیکھنے لگا جیسے وار کرنے سے پہلے جائزہ لے رہا ہو کہ میں سہہ بھی سکوں گا یا نہیں پھر مسکرایا ''خدا کے فضل سے آپ کی تو دو ٹانگیں ہیں آپ کو اپنی ٹانگوں کا خیال رکھنا چاہیے یہ بہت کارآمد چیز ہیں'' پھر اس نے قہقہہ لگایا اور اپنی بیساکھی کو تھپکتے ہوئے کہا ''یہ بھی میرے لئے بہت کارآمد ہے''

میں ناشتہ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وہ دونوں آ گئے افضل خان بھی اور بیساکھی والا بوڑھا بھی میں چائے بنانے لگا تو افضل خان نے آگے بڑھ کر ماچس اٹھالی ''چائے بنانا میرا حق ہے اور میرے اس حق کی حفاظت کرنا آپ پر فرض ہے''

میں اور افضل چائے کی پیالیوں میں کچھ تلاش کرنے لگے تو بوڑھے نے قہقہہ لگایا ''افضل پریشان تھا کہ ہم نے رات آپ کو ڈسٹرب کیا میں نے کہا کوئی بات نہیں اتنا تو ہمارا حق بنتا ہی ہے اور ہمارے اس حق کی حفاظت آپ پر فرض ہے''

افضل خان مسکرایا ''خان بابا میرے کالج کے استاد ہیں ان کا پیغام ملا فوراً آ جاؤ تو آپ کو چھوڑ کر جانا میرا فرض تھا مجھے امید ہے آپ نے برا نہیں ماننا ہو گا''

''لیکن آپ کا بازو بھی۔۔۔۔''

''اس کا بازو بھی میری ٹانگ کے پاس چلا گیا ہے کمانڈر کی ٹانگ اور سپاہی کا بازو جہاں بھی ہیں اکٹھے ہی ہوں گے'' بوڑھے نے میرا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی جواب میں قہقہہ لگا دیا۔

پھر ہم روز ملنے لگے افضل اور اس کا کمانڈر صبح سویرے آ جاتے تھے افضل ناشتہ تیار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتا ہم چائے پیتے وہ اپنی وادی اس کے باسیوں اور پرندوں کی موت کی کہانیاں سناتے

''سب مرگیا تو افضل کالج چھوڑ کر مزدوری کرنے چلا گیا ہمیں ضرورت تھا وادی کو آزاد جو کرانا ہے ہم نے اسے بلا لیا لیکن یہ ہسپتال میں بھی آپ کا نام لے لے کر بڑبڑاتا رہتا تھا اچھا ہوا اس کا گیت آپ کے کان تک پہنچ گیا یہ بہت یاد کرتا تھا آپ نہ ملتے تو یہ اپنی مردہ وادی میں واپس جا چکا ہوتا میں نے کہا اب جب تک صاحب ادھر ہیں کھانا پکاؤ اور ہماری خدمت کرو۔''

''مگر اس کا تو بازو ایک ہے۔۔۔''

''ٹانگ تو دو ہے کوئی فرق نہیں پڑتا'' بوڑھے کی بجائے افضل خان نے میری بات کاٹی

ایک دن ہم تینوں بستی کے چھپر چائے خانہ کی میز پر بیٹھے تھے افضل خان مجھے اپنی روانگی کے بعد کی کہانی سنا رہا تھا کہ تین نوجوان چھپر میں داخل ہوئے افضل اٹھ کر ایک ایک سے گلے ملا آنے والوں میں سے ایک کے سر پر پٹی بندھی تھی دوسرے کا بازو رسی سے گلے میں لٹک رہا تھا اور وہ چاروں قہقہے لگا رہے تھے اور میں حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا ''یہ قہقہے ہی تو ہمارا ہتھیار ہیں اگر آنسوؤں سے اپنے پہاڑ اور وادیاں آزاد کرانا ممکن ہوتا تو میں اکیلا اتنے آنسو بہا سکتا ہوں کہ یہ سامنے والے سب پہاڑ ان کے سیلاب میں ڈوب جائیں پر آج تک کوئی قوم آنسوؤں کی مدد سے اپنے دشمن کو کبھی شکست نہیں دے سکی'' بوڑھے نے مجھے پریشان دیکھتے ہوئے کہا

میری آنکھوں کے سامنے اوپر فضاء میں افضل خان کا بازو لہرا رہا تھا اور وہ چاروں قہقہے لگا رہے تھے اور ان کا کمانڈر اپنے ساتھیوں کے ہتھیاروں کی گونج پر مسکرا رہا تھا میرے خون میں ان کے قہقہوں سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں میں اپنے وجود کے گھٹنے پر سر رکھ کر تڑپ رہا تھا بوڑھا مجھے وہیں تڑپتا چھوڑ کر اپنے سپاہیوں کی ٹول میں جا شامل ہوا اور ان کے ساتھ مل کر قہقہے لگانے لگا

اور میرے لئے اپنے وجود میں واپس آنا اور بھی دشوار ہو گیا

☆☆☆☆☆

نقاب پوش

میں نے ایک اور سلپ لکھ کر پھاڑی تو گھڑی کی سوئیاں مسکرا دیں خبر بنا کر مجھے جلد ہوٹل پہنچنا تھا اور خبر بن نہیں رہی تھی وہ تیسری سلپ تھی یا پھر چوتھی سلپ ہوگی ہر بار انٹرو کمزور رہ جاتا تھا اور گھڑی کی سوئیاں بھاگی جا رہی تھیں میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی ہوٹل میں میرا ایک ہم بچپن میرا منتظر تھا اور خبر میں زور پیدا نہیں ہو رہا تھا طاہر بہت عرصہ پہلے کہیں کھو گیا تھا اور شام اس کا ٹیلیفون آیا تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے اور میں وہ خبر اسی روز چھپوانا چاہتا تھا اور نیوز ایڈیٹر کے حوالے کر کے جانا چاہتا تھا

ایک وقت تھا جب ہم دونوں مل کر خواب دیکھا کرتے تھے شہر کی سڑکوں پر مرغ صبح آگاہ کی بیداری تک اپنے مشترکہ خواب بکھیرتے اور سمیٹتے رہتے تھے جب لوگ اپنی آنکھوں پر نیند کے پردے کھینچ لیتے تو ہم اندھیروں میں روشنی کی تلاش میں نکل پڑتے تھے پھر کسی طرف سے کسی مرغ کی آواز آتی چاروں طرف سے مرغوں کی اذانیں بلند ہونا شروع ہو جاتیں تو ہم اپنے خوابوں کی بھاری گٹھڑی وقت کے کندھے پر رکھ کر جلد ملنے کے لئے تھوڑے وقت کے لئے جدا ہو جایا کرتے تھے

ایک شب مرغ کی پہلی اذان کے ساتھ جب میں نے جدا ہونے سے پہلے اسے بتایا تھا کہ میں ایک اخبار میں رپورٹری کرنے جا رہا ہوں تو وہ اس خبر پر مجھ سے بھی زیادہ خوش ہوا تھا اور ''سچ روشنی ہے'' کا نعرہ بلند کر کے ناچتا ہوا اپنی کچھار کی طرف چلے گیا تھا پھر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رپورٹری کرتا رہا اور وہ ''حق سچ'' کے نعرے لگاتا رہا اور خواب دیکھتا رہا اور پھر کہیں گم ہو گیا تھا
وہ کبھی کبھی میری کسی خبر پر گم سم سا ہو جاتا تھا اور جب میں اسے خوابوں کی دنیا سے نکال کر
چاروں طرف بکھرے حقائق کی طرف لانے کی کوشش کرتا تھا تو خاموشی سے جدا ہو جایا کرتا تھا
اور پھر اچانک کہیں گم ہو گیا تھا

یہ بھی ہو سکتا ہے وہ گم نہ ہوا اور ہم کسی موڑ پر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں مگر میں
یہی سمجھتا رہا تھا کہ طاہر گم ہو گیا ہے اور آج وہ خود ہی کہیں سے آ گیا تھا اور میں خبر بنا کر جلد از
جلد اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر خبر میں وزن پیدا نہیں ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بنائی ہوئی خبر
ایک بار پھر پھاڑ دی تھی اور مجھے اپنے پر اور گھڑی کی سوئیوں پر غصہ آنے لگا تھا

باقی سب رپورٹر اپنی اپنی بیٹ کی خبریں جمع کروا کر اپنے اپنے آشیانوں اور
ٹھکانوں کی طرف جا چکے تھے کرائم رپورٹر ہسپتالوں کے مردہ خانوں کا چکر مکمل کر کے ابھی
واپس نہیں آیا تھا اور رپورٹنگ روم میں تنہا بیٹھا میں اس روز کی خبر میں وزن پیدا کرنے کی کب
سے کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار خبر کا پیٹ خالی رہ جاتا تھا اور خالی پیٹ نہ کوئی بٹیر جواں مردی سے لڑ
سکتا ہے نہ ایسی خبر قومی خدمت کے محاذ پر کامرانیاں حاصل کر سکتی ہے

معاون نے چائے کا ایک اور کپ میرے سامنے رکھ کر سرگوشی کے انداز میں اپنے
گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ''سر اپنے دوست سے میرا بھی ایک کام کروا دیں'' کہا
تو میں نے اسے ڈانٹ پلا دی اس کی آنکھوں میں بھوک کے ڈورے بہت گہرے ہو رہے تھے
میں نے قلم رکھ دیا اور چائے کی پیالی میں سوچ کا جال پھینک کر خاموش بیٹھ گیا خان صاحب
سے اپنی دوستی کا عرصہ میلوں اور سنگ میلوں میں ناپنے لگا اس لمبائی کا وزن بہت زیادہ تھا مگر
خاں صاحب کی خبر میں اتنا وزن پیدا نہیں ہو رہا تھا

اس رات بھی اتفاق سے رپورٹنگ روم میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا ایک خستہ
حال تھکا ماندہ سا نوجوانی سے ڈھلتا ہوا آدمی اپنے چہرے پر بے رونقی کی نقاب چڑھائے
دروازہ کھول کر اندر آیا اور کافی دیر تک خوفزدہ سا کھڑا رہا پھر اس نے ایک بیان مجھے پیش کرتے
ہوئے کہا تھا ''سر اس کو دیکھ لیں تو مجھ پر کرم ہو گا''

میں نے بیان پکڑ کر اوپری اوپری سی نظر میں تولا اور ٹرے میں رکھ دیا
وہ ابھی تک اسی دست بستہ قسم کی حالت میں کھڑا تھا ''سر میرا نام ۔۔۔ خان ہے اور میں آپ کا

خادم ہوں''

میں نے اس کی نگاہوں میں جھانکا تو ان میں کچھ بھی نہ تھا نہ روشنی نہ اندھیرا

وہ آتا رہا چہرے پر بے رونقی کی نقاب اوڑھے خالی آنکھوں کے ساتھ خستہ حال اور
بے وزن سا خان پھر ہماری واقفیت گہری ہونے لگی تو اس کے بیانوں کا وزن بھی بڑھنے لگا اس
کے چہرے پر رونق آنے لگی، ہم دونوں بھی راتوں کو سڑکوں پر گھوم گھوم کر خواب دیکھنے لگے تھے
اور اس کے خواب پورے ہونا شروع ہو گئے تو اس کا وزن محسوس کیا جانے لگا اور پھر وہ بہت
وزنی ہو گیا تھا پہلے وہ مجھے سر کہا کرتا تھا اور اب میں اسے ''سر سر'' کہنے لگا تھا اور آج اس نے
ٹیلیفون پر مجھے ایک خوش خبری سنائی تھی اور قوم تک یہ خوشخبری اچھی طرح پہنچانے کا فرض مجھے
سونپ دیا تھا اور مجھ سے اس خوشخبری میں وزن پیدا نہیں ہو رہا تھا اور ہر بار خبر کا پیٹ خالی رہ
جاتا تھا

میں نے دراز سے نوٹ بک نکال کر دماغ کے کمپیوٹر میں اعداد و شمار فیڈ کر کے بٹن
دبایا تو سکرین پر بڑی زوردار خبر نمودار ہو گئی اور اسی وقت زوردار خبر بنتی بنتی کہیں غائب ہو گئی
سکرین بالکل شفاف نظر آنے لگی جیسی پہلے تھی ویسی ہی بانجھ ہو گئی میں نے کمپیوٹر میں دو سو ملین
ڈالر فیڈ کر کے دوسرا بٹن دبایا تب ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی ان دو سو ملین ڈالر میں سے گندے
دانتوں کی نمائش کرنے والے میرے معاون کے مقدر میں کتنے پیسے لکھے ہیں؟ ملک کے اس
جیسے گندے دانتوں والوں کا اس سے کتنا مقدر سنور سکے گا؟ اور قوم کی کس قدر فلاح و بہبود ہو
سکے گی؟ ڈالر کو پاک پیسے میں تبدیل کرنے سے خبر میں وزن پیدا ہو گیا ان دو سو ملین ڈالر میں
سے ہر بندے کے حصہ میں ایک سو پچاس پیسے آتے تھے اور سو کا ہندسہ کوئی کم تو نہیں ہوتا اس
خیال سے کہ پیسے میں موری بھی ہوتی ہے بعض دفعہ میں نے حساب کتاب کا کھاتہ بند کر دیا اور
دو سو ملین ڈالر کے قوم اور قومی معیشت پر نہایت خوشگوار اثرات کی خبر مکمل کر کے ہوٹل جانے کی
تیاری کرنے لگا مجھے یقین تھا کہ اس خبر سے عوام کے دلوں میں خان صاحب کا اور خاں صاحب
کے دل میں میرا وزن مزید بڑھ جائے گا

''اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو اور مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ'' ایک آواز نے رپورٹنگ روم
کے مقدس سکون میں خلل پیدا کر دیا

میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے ایک نقاب پوش کھڑا تھا اس کی سیاہ نقاب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے پیچھے سے تیز شعاعیں نکلتی ہوئی میرے چہرے پر مرکوز ہوگئی تھیں
اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ میرے سر کا نشانہ باندھے کھڑا تھا
''پستول میز پر رکھ دو اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کرا دوں گا'' میں نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے حکم دیا
اس نے قہقہہ لگایا ''تم مجھے بھی بے وقوف سمجھتے ہو!''
گھنٹی اور ٹیلی فون سیٹ اس نے کہیں غائب کر دیئے تھے
وہ میری طرف بڑھ رہا تھا آہستہ آہستہ قدم جماتا ہوا نقاب کے سوراخوں سے نکلنے والی شعاؤں سے میرا سر چکرانے لگا وہ آہستہ آہستہ قدم جماتا ہوا میری طرف بڑھتا رہا اور میں اس کے سامنے کھڑا رہنے یا شاید کھڑا نہ رہنے کی کوشش کرنے لگا ''تم تو آئے نہیں میں خود ہی حاضر ہو گیا ہوں اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟'' اس نے پستول میری کنپٹی پر رکھ دیا اور نقاب اتارتے ہوئے پوچھا
''طاہر تم! مگر یہ کیا ڈرامہ ہے تم کیا ڈرامہ کر رہے ہو؟''
''ڈرامہ؟ تم میرے ساتھ ڈرامہ کرتے رہے ہو یا میں کر رہا ہوں ڈرامہ؟'' اس نے طاقت ور مکا میری ناک پر رسید کرتے ہوئے کہا
میری ناک سے خون کا پھوارہ پھوٹ پڑا سر چکرا گیا اور ہاتھ کانپنے لگے
اس نے خبر اٹھائی اور پڑھے بغیر میرے منہ پر دے ماری میری بڑی محنت سے بنائی خبر کی سلیں میرے پاؤں میں بکھر گئیں اس کی آنکھوں سے تیز شعاعیں پھوٹ رہی تھیں سب شعاعیں میرے زخمی چہرے پر جم گئی تھی اور وہ سامنے کھڑا ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پہنچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے وہی سیاہ نقاب اٹھائی جو پہنے وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اپنے سخت کھردرے ہاتھوں سے وہ نقاب میری زخمی ناک اور چہرے پر چڑھا کر کمرے سے باہر نکل گیا
اسی لمحے کرائم رپورٹر کمرے میں داخل ہوا وہ بہت خوش تھا ''آج مردہ خانے سے بڑی اچھی خبر مل گئی ہے ایک دوست نے اپنے بچپن کے دوست کو گولی مار دی''
ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری طرف طاہر تھا ''یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہو ہمارے ساتھ ہم نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا''

''مگر؟''
''مگر کیا؟''
''وہ تم؟''
ہاں ہاں وہ میں ہی ہوں جلدی آؤ صابر اور ضمیر بھی آئے ہوئے ہیں ہم نے تمہاری طرف گاڑی بھجوا دی ہے تم نے تو ہماری ایک اور رات ضائع کر دی ہے ابھی مرغ اذانیں شروع کر دیں گے۔'' اس نے بات ختم کی۔
''بہت اچھی خبر مل گئی آج تو مردہ خانے سے کوئی اپنے بچپن کے دوست مریض کی تیمارداری کے لئے آیا اور اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا'' کرائم رپورٹر نے اپنی ادھوری بات مکمل کرنا چاہی
''اس نے سیاہ نقاب تو نہیں پہنی ہوئی تھی؟'' میں نے اپنی ناک ٹٹولتے ہوئے پوچھا
''وہ تو میں نے دیکھی نہیں مردہ خانے میں مریض کی برہنہ لاش ہی دیکھی ہے میں نے تو'' وہ کھردرے کاغذ پر تیز تیز قلم چلانے لگا
نیوز روم سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں گھڑی کی سوئیاں تیزی سے دوڑ رہی تھیں ''جلدی کرو کاپی جانے والی ہے'' میں نے ایک بار پھر اپنی ناک ٹٹولتے ہوئے کرائم رپورٹر کو ہدایت کی
''سر وہ کسی طاہر صاحب کا ڈرائیور آیا ہے'' گندے دانتوں والے معاون نے آہستہ سے اطلاع دی
''جاؤ اسے کہو دفان ہو جائے یہاں سے ورنہ میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا مجھے نہیں جانا کسی طاہر واہر سے ملنے۔'' میں نے غصہ سے اسے ڈانٹ دیا
کھردرے کاغذ پر قلم چلاتے کرائم رپورٹر نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سر جھکا کر مسکرانے لگا

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راوی کی ریشم

کرم علی کا خیال ہے کہ اس نے ریشم کہانی چورا کر پوری نیکی کی ہے میں جب بھی اس کی آدھی نیکی کا کوئی ورق الٹتا ہوں تو پوری کہانی میرے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ ''ریشم نے شیرنی بن کر اپنے بھائی کے معصوم بیٹے کی پرورش کی اسی طرح جس طرح جنگل کی شیرنی اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ انہیں جنگل میں زندہ رہنے کے ڈھنگ سکھاتی ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے بچے اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں انہیں اس کی مدد اور چھاؤں کی کوئی ضرورت نہیں رہی تو وہ انہیں جنگل کے کسی گھنے حصہ میں چھوڑ کر کہیں چلی جاتی ہے بڑی خوشی اور اطمینان کے ساتھ پھر کبھی نہ ملنے کے سفر پر نکل پڑتی ہے شیرنی کا فرض وہاں ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایک بار پھر اکیلی رہ جاتی ہے اور جنگل کے شیر اس کی اس تنہائی پر بہت خوش ہوتے ہیں اور ان کے جسم ٹوٹنا شروع ہو جاتے ہیں ان کے دلوں میں نئی امنگیں جاگ اٹھتی ہیں ریشم کا فرض پورا ہو گیا تو فضلو کے دل میں بھی نئی امنگیں کروٹیں لینے لگی تھیں اور ریشم بندوق اٹھا کر فضلو کے شکار پر نکل پڑی تھی۔''

کہانی یہیں ختم ہو جاتی تو میں اس چوری کو پوری نیکی مان لیتا پر کہانی تو یہاں ختم نہیں ہو سکی تھی اور وہ ادھوری کہانی چورا کر پوری نیکی کا دعوی کرتا ہے

بہت پرانی بات ہے اس وقت کی جب ہم پرلا ہور پر اور راوی کے کناروں پر تین شیروانیوں کا سایہ ہوتا تھا اور راوی نے ہم اہل لاہور کی خادم خلق شیروانی کے شرقپور کی طرف

کے زرعی فارمز پر یلغار کر دی تھی شاید راوی کے دل میں بھی اپنی طاقت اور آزادی کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی شیروانیاں تین تھیں اور راوی اکیلا تھا اور اس کو تینوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اور سارے پاکستان کی خادم خلق شیروانی نے پنجاب کی مہربان شیروانی کو حکم دیا تو اس نے راوی کی لہروں کے سامنے پتھروں کی دیوار کھڑی کرنا شروع کر دی تھی

راوی ہار ماننے والا کب تھا اس نے اپنی تند و تیز لہروں کا رخ ان لوگوں کے کھیتوں باغوں اور بستیوں کی طرف موڑ دیا جو شیروانیاں نہیں پہنتے تھے شیروانیاں زدگان جلوس بنا بنا کر اخباروں کے دفتر کے سامنے ''ہمیں شیروانیوں سے بچاؤ'' کے نعرے لگاتے رہے اور راوی کا شیروانیوں سے مقابلہ جاری رہا ان جلوسوں میں ایک جوشیلا نوجوان شیروانیوں کے خلاف نعرے لگوایا کرتا تھا اور ان جلوسوں اور نعروں کی خبریں چھپوانے ہمارے دفتر آیا کرتا تھا وہ نعرے لگاتے رہے خبریں چھپواتے رہے اور راوی ان کا سب کچھ بہا کر لے گیا اور اس جوشیلے نوجوان کو ہمارے دفتر کا راستہ دکھا گیا

اس وقت مجھے اس جوشیلے نوجوان کی آنکھوں میں کسی کہانی کی کوئی دھاری دکھائی نہیں دی تھی اور اب کرم علی نے اس کی گھڑی ادھوری کہانی چورا کر پوری نیکی کمانے کا دعوی کر دیا ہے اور میں جب بھی اس کی ریشم کہانی کا کوئی ورق کھولتا ہوں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے ایک شام اس نے وہ کہانی شروع کی ''چناب کی سوہنی کی کہانی بڑی عجیب ہے پر راوی کی ریشم کہانی کے مقابلہ میں تو وہ کچھ بھی نہیں چناب کی سوہنی نے اپنے مہینوال پر اپنی جندڑی وار دی تھی اور راوی کی ریشم نے اپنے مہینوال کو گولی مار دی تھی چناب کی لہروں کو پتہ نہیں سوہنی یاد بھی ہے یا نہیں پر راوی کی لہریں آج بھی اپنی ریشم کو یاد کرتی ہیں اور جب بھی ساون بھادوں میں راوی اچھلتا کودتا ہے تو اس کی چھلوں کی زبان پر ریشم! ریشم! ہوتا ہے''

''یہ جندڑی وندڑی وارنے والی باتیں سب بکواس ہیں بیٹی کمہار کی ہو اور کچے پکے گھڑے کی پہچان نہ کر سکے؟ یہ سب کہانیاں گھڑنے والوں کا لگایا تڑکا ہے کچھ عشق کا تڑکا کچھ گھڑے کا تڑکا آپ مہربانی کر کے ذرا ہاتھ ہولا رکھیں اور بیچاری ریشم کے عشق کو گولی کا تڑکا نہ لگائیں آپ نے کون سی فلم بنانی ہے کہ گولی کے بغیر چلے گی نہیں'' کرم علی نے مرزا اسلم قلندری کی کہانی میں سوراخ ڈھونڈنا شروع کر دیا

اخبار کے دفتر میں رپورٹروں کا کمرہ کہانیوں کی ورکشاپ ہوتا ہے رپورٹر سارا دن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانیوں کے پرزے جوڑنے میں لگے رہتے ہیں اور شام ہوتے ہی ان نئی پرانی کہانیوں پر نیا رنگ روغن چڑھا چڑھا کر اخبار کا پیٹ بھرنے میں جت جاتے ہیں کسی اخبار کی سرکولیشن اور معیار کا دارومدار اس کے رپورٹروں کی کہانیاں بنانے اور چلانے کی مہارت پر ہوتا ہے اور کہانیاں بنانے اور چلانے کی اور اخبار اور مالک کا پیٹ بھرنے کی مقابلہ کی دوڑ میں ان کے پاس کسی کی ریشم کہانی سننے کو وقت ہی نہیں بچتا پر اسلم قلندر کے گولی چلاتے ہی میرے قلم کے گلے میں سیاہی کا نوالہ پھنس گیا میں نے اسلم قلندر کی آنکھوں میں جھانکا تو ان میں ویرانیوں کی بہت گہرائی تھی ایسی ویران گہرائی جیسی راوی کنارے کسی قبرستان میں ہوتی ہے جس کا زیادہ حصہ راوی بہالے گیا ہوتا ہے

لمبے قد کے ہلکے پھلکے کرم علی کے باریک ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کی ہلکی سی تہہ جمی رہتی ہے اور جب وہ لفظوں کے تیر کمان میں چڑھانا شروع کرتا ہے تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے ''آپ نے بنیادی خیال تو بنالیا ہے لیکن نکلے گی آپ کی ریشم بھی بیوقوف ہی چناب کی سوہنی کی طرح''

''بنیادی خیال تو ابھی آیا ہی نہیں''

''لانا بھی نہ کسی فلم والے نے چورالیا تو نیا وکھت پے جائے گا''

قلندر نے ورق الٹا دیا ''راوی تو اب تک ریشم کے لئے اداس ہے اس نے کبھی ایسی لڑکی تو دیکھی ہی نہ تھی ریشم بڑی وکھری قسم کی لڑکی ہوتی تھی اس کی ہر بات سب سے الگ تھی اس نے کبھی گھر سے باہر جھانکا تک نہ تھا کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ چوہدری جلا کی کوئی بیٹی بھی ہے پھر جب چوہدری جلا مر گیا تو وہ نقاب اوڑھ کر گھوڑے پر سوار ہو گئی تھی ہاتھ میں چھانٹا پکڑ کر اس نے زندگی کی پگڈنڈی پر سرپٹ گھوڑا دوڑا دیا تھا اور اپنے بھائی عاشو کا باپ بن گئی تھی اور راوی کے کناروں پر ریشم ریشم ہونے لگا تھا لوگ کہتے یہ تو کوئی جل پری ہے اور اپنا چہرہ چھپائے رکھتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چل جائے پر آپ تو جانتے ہیں حسن کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے اور بیلے کے ہرن بھی ریشم کے حسن کی خوشبو سے مدہوش ہو ہو جاتے تھے اور پھر اس نے اپنے بھائی کی بڑی دھوم سے شادی کی اور چپکے سے فضلو کے ساتھ بھاگ گئی فضلو بھی ٹھیک ہی تھا پر ریشم کا جوڑ تو نہیں تھا نا وہ ہو سکتا ہے نقاب کی وجہ سے وہ اسے اچھی طرح پہچان نہ سکی ہو''

''وہ فضلو کے ساتھ نقاب سمیت بھاگ گئی تھی یا نقاب کو اتار کر بھاگی تھی؟''

''میری کہانی اس بارے میں خاموش ہے''

کرم علی نے وہیں سے کرائم رپورٹر کو آواز دی ''بٹ صاحب اپنے مرزا صاحب کی ریشم کو کوئی نقاب سمیت اغوا کر کے لے گیا ہے آپ ہی ان کی کوئی مدد کریں، کہانی چھپ نہ سکے تو فلم ہی بن جائے''

بٹ اپنے بڑے سے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سامنے بیٹھے درجن بھر سائلوں کی طرف اشارہ کر کے مسکرایا ''مرزا صاحب کو چائے پلا کر ٹھنڈا کریں میں ذرا ان سے فارغ ہولوں پھر ریشم کو بھی چھڑاتے ہیں''

کمرے میں سائلوں کی بھیڑ ہو گئی تھی کرم علی نے چائے کی پیالیاں ایک بار پھر سب کے سامنے جمائیں اور اونچے سروں میں ''گنجا ککڑ آنڈے دیوے'' گنگنانے لگا سائلوں میں کچھ پیشہ ور خوشامدی ہوتے ہیں جو بلا ضرورت بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں کرم علی ایسے فنکاروں کو خوشامد کے انڈے دینے والی مرغیاں کہا کرتا تھا اور ایک سال خوردہ گنجے خوشامدی کو دیکھتے ہی ''گنجا ککڑ آنڈے دیوے'' کا نغمہ شروع کر دیا کرتا تھا اس کا مطلب ہوتا تھا کہ کاپی جانے کا وقت قریب تر ہو رہا ہے اپنی اپنی کہانیاں جلد مکمل کر کے نیوز روم بھیج دو اور ان مرغیوں کو کڑکڑانے اور گنجے ککڑ کو پھڑ پھڑانے دو

کرم علی کی رپورٹنگ روم میں خدمت کی عمر بہت طویل تھی اور وہ سالخوردہ خوشامدی گنجا ککڑ آنڈے دیوے گنگنانا شروع کر دیا کرتا تھا اور رپورٹروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں اور کاغذوں پر کہانیاں پھیلنا شروع ہو جاتی تھیں ہمارے قلم تیز تیز چلنے لگے تو مرزا اسلم قلندر نے کہانی سمیٹ کر میرے سامنے رکھ دی اور کرم علی سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا کچھ عرصہ سے مرزا اسلم کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا اور کرم علی اس کے قلندری چوغہ کی جیبوں میں سوراخ ڈھونڈنے میں لگا رہتا تھا

کوئی رپورٹر کسی رات اپنی یا کسی اور کی غلطی سے جلد اپنے گھونسلے میں پہنچ جائے تب بھی اسے جاگتے رہنا ہوتا ہے اس وقت تک جاگنا ہوتا ہے جب پریس مینیجر لوکل ایڈیشن کی کاپی وصول کر کے سب ٹھیک ہے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دے وہ مرحلہ آنے تک نیوز ایڈیٹر اس کی گھڑی کسی بھی کہانی میں ترمیم و اضافہ کے لئے اس سے رابطہ کر سکتا ہے اور اگر کوئی نیوز ایڈیٹر اپنا یہ اختیار نہ استعمال کرے تو اس کی نیوز ایڈیٹری خود اسے بھی پھیکی پھیکی اور بدمزہ سی لگتی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریس مینیجر کے سب ٹھیک ہے کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا وقت گزر گیا اور میں مرزا اسلم قلندر کی ریشم کہانی کے تانے بانے میں الجھا کروٹیں بدلتا رہا یقین سا ہونے لگا تھا کہ اس کہانی کے کسی موڑ پر مرزا اسلم قلندر بھی کہیں موجود ہے اور تھوڑی سی کوشش سے مرزا کے قلندری چوغہ میں بھی کوئی سوراخ مل سکتا ہے میں ریشم کہانی کو ادبی کہانی کی بجائے ایک کرائم اسٹوری کے طور پر دیکھنے لگا تھا بٹ صاحب جرائم کے پانیوں میں مچھلیاں پکڑنے کے ماہر تھے میں نے انہیں ریشم کہانی کی واقعاتی تحقیق پر لگا دیا اور خود کہانی الٹ پلٹ کر شک اور یقین کے مختلف زاویوں سے جانچنے بیٹھ گیا۔

چند روز کی تحقیق سے مرزا اسلم قلندر کی ریشم کہانی کے نئے رنگ ابھرنے لگے ایک وقت تھا کہ مرزا اسلم قلندر صرف مرزا اسلم ہوتا تھا اور اس میں اتنی تپش ہوتی تھی کہ جب وہ اپنے ڈیرے پر دربار لگاتا تھا تو تین چار کلومیٹر دور سے گزرنے والوں کے پاؤں کے تلوے جلنا شروع ہو جایا کرتے تھے اور پھر اچانک قلندری چوغہ پہن کر وہ قلندر ہو گیا تھا ریشم کے فضلو کے ساتھ بھاگ جانے کے بعد مرزا نے اس کے بھائی عاشو کو اپنی گود میں لے لیا تھا اور جب فضلو نے عاشو کو قتل کر دیا تو اس کی ایف آئی آر تھانے میں مرزا اسلم قلندر نے خود لکھوائی تھی اس نے لکھوایا تھا کہ اگر فضلو عاشو کو قتل نہ کرتا تو عاشو فضلو کو قتل کر دیتا" عاشو کے قتل کے بعد ریشم اسے چھوڑ کر واپس آبائی گھر چلی گئی تھی اور اپنے بھائی کے بیٹے کی جنگل کی شیرنی کی مانند تربیت کرنے لگی تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کے بھائی کے بیٹے کو زندہ رہنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہو گی تو اس نے چھانٹا رکھ کر بندوق اٹھالی تھی اور فضلو کے باپ نے اپنے بیٹے کے قتل کی رپٹ صرف ریشم کے خلاف لکھوائی تھی" وہ بھائی کا بدلہ لینا چاہتی تھی"

کرم علی پوچھتا رہا اور میں اسے ٹالتا رہا وہ مرزا اسلم قلندر کی ریشم کہانی اخبار کے ادبی ایڈیشن میں چھپوانا چاہتا تھا پھر ایک شام ڈھلے مرزا اسلم قلندر آ گیا اور کرم علی اس کے قلندری چوغے کی جیبوں میں سوراخ ڈھونڈنے لگا" آپ کی کہانی پر تو فلم بننا شروع بھی ہو گئی ہے آپ نے کوئی پرواہ ہی نہیں کی ریشم کیا سوچتی ہو گی آپ کے بارے میں؟"

مرزا نے مسکرانا چاہا مگر اس کی مسکراہٹ کو اس کے قلندری چوغہ نے دبا لیا

چائے جم چکی تو میں نے تفتیش شروع کی" فضلو نے عاشو کو قتل کر دیا اور سزا سے بچ گیا کیسے؟"

قلندر نے جواب دیا" یہاں ہوئی ہے کبھی کسی قاتل کو سزا؟ سزا تو ہمیشہ کمزور اور مقتول کو ہوتی

ہے اور فضلو تو طاقتور قاتل تھا نہ گواہ نہ سزا"۔

"گواہ آپ تھے رپٹ لکھوا کر آپ کہانی لکھنے بیٹھ گئے ورنہ فضلو کو سزا ہو جاتی اور ریشم کو اسے گولی نہ مارنا پڑتی اور وہ پھانسی سے بچ جاتی"

قلندر حیرانی کے پریشان پانیوں میں ڈبکیاں لینے لگا اس نے اپنے حواس کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" میرے مقدر میں جتنی نیکی لکھی تھی میں تو اتنی ہی کما سکتا تھا"۔

"سنا ہے فضلو نے وصیت کی تھی کہ اسے ریشم کی نقاب کی چادر کا کفن دیا جائے"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے" الفاظ قلندر کے حلق میں پھنس گئے

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ان میں ویرانی ہی ویرانی تھی جیسے راوی کی لہریں قبرستان کی باقی قبریں بھی بہالے گئی ہوں اور آخری قبر اداس اور تنہا رہ گئی ہو اور وہ لہروں کو آوازیں دے رہی ہو" ریشم آپ کو اس لئے تو قتل نہیں کرنا چاہتی تھی کہ آپ اس کی کہانی نہ لکھ دیں؟"

اسلم قلندر نے کہانی اٹھائی اور بغچی میں ڈال کر کوئی جواب دئے بنا خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے کمرے میں خوشامد کے انڈے دینے والی مرغیاں اور گنجے کلغڑ ہجوم کئے ہوئے تھے کسی نے مرزا اسلم قلندر کے جانے کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تھا اور میرے قلم کے پاؤں مرزا اسلم قلندر کے چوغہ کی جیبوں کے سوراخوں میں پھنس گئے تھے کرم علی نے ریسیور اٹھایا اور چیخنے لگا" مرزا اسلم قلندر مر گیا! مرزا اسلم قلندر مر گیا!" وہ سیڑھیوں کی طرف دوڑا اس کے پیچھے میں دوڑا میرے ساتھ کرائم رپورٹر دوڑا ہم سب دوڑتے ہوئے نیچے گئے تو اسلم قلندر سیڑھیوں کے پاس مرا پڑا تھا اور اپنی ریشم کہانی والی بغچی اس نے سینے سے لگائی ہوئی تھی اور راوی کی ریشم کی ادھوری کہانی مکمل ہو گئی تھی

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حق شناس

میں نے سارے اخباروں کی ساری بڑی بڑی سرخیاں دیکھیں کہیں بھی کوئی بھی بڑا فرق نہ ملا ساری بڑی بڑی خبریں اور ان کی بڑی بڑی سرخیاں ایک ہی جیسی تھیں ان بڑے بڑے اخباروں میں ان کے ناموں کے چوکھٹوں کا ہی فرق تھا جیسے میانی صاحب کے قبرستان میں قبروں پر لگائی ناموں کی تختیوں کا ہی فرق ہے یا پھر رنگ وروغن سے قبروں کو ایک دوسری سے ممتاز کرنے کی سعی کی ہوتی ہے ہیں وہ سب قبریں ہی خبروں کی قبریں بن جانے کا دکھ میرے شعور کی گہرائی میں اتر گیا میں ان بڑی بڑی خبروں میں چھپے چھوٹے چھوٹے سچ ڈھونڈنے لگا سچ جو بڑی خبروں کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ گئے تھے جھوٹ کی فصل سچائی کے خون پر پلتی بڑھتی ہے اگر کوئی بچی کھچی سچائیاں مل بھی گئیں تو میں ان کے دھاگوں سے کوئی بڑی خبر بن سکوں گا؟ میرے اندر کہیں سے ایک مدھم سی آواز کانوں میں خارش کرنے لگی سچائیاں کسی کام کی ہوتیں تو اتنے بڑے بڑے اخباروں والے بڑے بڑے لوگ ان کی اتنی بڑی بڑی قبریں کیوں بنا دیتے؟ آواز مجھے کچھ سمجھانے اور بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے دبا دیا ''دوپہر میانی صاحب کی بڑی جنازگاہ میں شیشہ کاٹنے والے کی نماز جنازہ ہے'' ٹیلیفون نے بتایا اور خاموش ہو گیا۔ آواز کس کی تھی؟ میں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا اور اس کی سچائی پر یقین کر لیا

مجھے جب ایک اخبار کی رپورٹنگ ٹیم میں جگہ میسر آئی تھی تو ایڈیٹر کو میں نے بتا دیا تھا

کہ میں کرائم اور کورٹس کی بیٹ کیلئے بالکل نااہل ہوں اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تو میں سمجھا میری نااہلی نوٹ کر لی گئی ہے پھر حالات نے کچھ ایسا پینترا بدلا کہ سیاست کی لڑائی اعلیٰ عدالتوں اور بار روموں میں منتقل ہو گئی انصاف اور سیاست میں جنگ ہونے لگی تو مجھے ہائی کورٹ کی بیٹ کرنا پڑ گئی۔ عدالت عدالت گھوم کر سچ ڈھونڈنے اور اسے جوڑ لگا کر خبر بنانے کے درمیان میں ایڈووکیٹ جنرل اور بار روم کے چکر بھی لگانا ہوتے تھے اور لاہور ہائی کورٹ کے عدالتی حصہ کو بار روم اور اس کی پرانی کنٹین سے الگ کرنے والی سڑک کے کنارے ایک نوجوان کھڑا ملتا تھا خاموش خاموش سا اٹھارہ بیس کے سن میں اس خاموش سے لڑکے نے چھوٹی موٹی کتابیں پکڑی ہوتیں تھیں اور عدالتوں کے اوقات انصاف ختم ہو جانے کے بعد بھی وہیں کھڑا ہوتا تھا میں نے کسی کو کبھی اس سے کوئی کتاب خریدتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ آگے بڑھ بڑھ کر آنے جانے والوں کو دعوت خرید دینے کی بے چینی میں ہوتا تھا ایک دوپہر ادھر سے گزرتے ہوئے ویسے ہی بلا مقصد میں نے پوچھ لیا ''آپ کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے، یہاں تو مفت کی کتاب کوئی نہیں پڑھتا آپ انہیں بیچنا چاہتے ہیں''

''دیکھیں کچھ ہو ہی جائے گا''

''کیا ہو جائے گا؟''

''اودھر چٹا گانگ میں شیشہ کاٹنے کا کام میں نے سیکھا تھا شیشہ کاٹنے کا قلم وغیرہ خریدنا ہیں کتابیں تو سیل اینڈ ریٹرن پر مل جاتی ہیں انشاءاللہ کچھ ہو ہی جائے گا''

سیاست، انصاف اور موسم میں کافی گرمی آ گئی تھی۔ اس سڑک پر جس کے کنارے وہ کھڑا ہوتا تھا گاڑیوں، پیدل چلنے والوں، وکیلوں، سائلوں اور منشیوں کی آمد و رفت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا پر وہ ویسے ہی کھڑا ملتا۔ ایک باریش وکیل کافی عرصہ سے مجھے چائے پلانے کو بے چین چلے آ رہے تھے اور میں وقت کی عدم دستیابی کا عذر فراہم کرتا آ رہا تھا ایک دوپہر بار روم کو جاتے ہوئے انہوں نے دعوت دہرائی تو میں نے فوراً قبول کر لی وہ بہت خوش ہوئے

''آپ کے بٹوہ میں کتنی رقم ہو گی؟''

''کافی ہے نہ بھی ہوئی تو کنٹین والے مجھ پر اعتبار کر لیتے ہیں''

''مجھے کچھ کتابیں پسند آ گئی ہیں ابھی خریدنا ہیں آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتے تو ماضی اور مستقبل کی چائے یک مشت ادا ہو جائے گی''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کئی ایک کتابیں چن لیں اور اس نے یک مشت ادائیگی کر دی۔

ان کے چلے جانے پر میں نے وہ سب کتابیں اس نوجوان کو واپس کرنا چاہیں ''میں حلال میں حرام نہیں ملا سکتا آپ نے ادائیگی کر دی یہ آپ کا حق ہیں میرا حق وہی جو مل گیا ہے'' اس نے جواب دیا

اس کے بعد وہ پھر کبھی وہاں نظر نہ آیا

گزر گئے لمحوں، مہینوں اور سالوں کے گرد و غبار میں بہت کچھ گم ہو گیا تھا۔ شدت کی گرم ایک دوپہر میں اس جگہ کھڑا تھا اس مقام پر جہاں ہائی کورٹ اور جی پی او کے درمیانی چوک میں ادھر اودھر سے آئے گاڑیوں کے گرم اور سرد دھارے نہ ملتے ہیں نہ جدا ہو سکتے ہیں گزر گئے لمحوں کے گرد و غبار میں خوفزدہ سا میں ان دھاروں سے پار اترنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا کہ کسی نے میرا بازو پکڑ کر اس بحر مردار کے دوسرے کنارے پہنچا دیا ''شکریہ'' میں نے اپنے حواس پر گرفت کی کوشش کے درمیان کہا تو وہ دونوں ہاتھوں میں میرا بازو تھامے جھک گیا ''یہ تو میرا حق ہے میں حق میں ناحق نہیں ملا سکتا''

اس کی آنکھوں میں عجب قسم کی چمک تھی حق میں ناحق ملانے کی بات نہ کی ہوتی تو میں اس کی شناخت بھی متعین نہ کر پاتا وہ اسی طرح پرسکون تھا جیسا میں اسے ہائی کورٹ کے عدالتی حصہ کو باررووم سے الگ کرنے والی سڑک کے کنارے خاموش کھڑا دیکھا کرتا تھا ''میں اب وہاں ہوتا ہوں شیشہ مارکیٹ میں''

میں نے خوف میں خوشی کی ملاوٹ محسوس کی

انصاف کی تلاش میں دونوں سچ کہتے ہیں وکیل بھی اور جج بھی مگر وکیل کو سچ بولنے سے پہلے سر کیوں جھکانا پڑتا ہے؟ ایک سچ دوسرے سچ کو کاٹتا ہے یا اس کی دلیل کی سچائی کی تردید کرتا ہے؟ سچ سے سچ کی تردید کا دھندا مجھے سمجھ نہیں آتا تھا ایک سچ کے سامنے دوسرے سچ کو اس لئے سر جھکانا پڑتا ہے کہ وہ سچ کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے؟ وزراء، وزیر اعظم، صدر مملکت، افسر اعلیٰ، سب سچ بولتے ہیں پریس کانفرنس میں، جلسہ عام میں، خطاب خاص میں وہ جو بھی کچھ بولتے ہیں سچ بولتے ہیں اخباروں کے رپورٹر پورے خلوص سے پوری مہارت کے زور سے ان کے سچ قلم بند کرتے ہیں اپنی مہارت سے خوب بنا سنوار کر وہ سچ قارئین کے لئے پیش کر دیتے ہیں اور جب دوسرے والے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ تو سچ نہیں تھا۔ آنے والے

اپنے سچ سے جانے والوں کے سچ کی تردید کرتے ہیں اور رپورٹروں کو ان کا سچ بھی اسی طرح قارئین کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ کیا ہوا؟ مجھے ان سارے سچ والوں کی سچائی کا ڈھول بجاتے رہنا دکھی سار کھنے لگا سچ کے اس طوفان میں خود میں کیا ہوں؟ ایک تنکہ بن کر کیوں بہے جا رہا ہوں؟ میں نے جمی جمائی رپورٹری چھوڑ دی اور شہر کے ایک گنجان بزنس والے حصہ میں ایک کمرے میں پناہ گزین ہو کر بیٹھ گیا، پہلی منزل پر کے اس کمرے کی بیرونی کھڑکیاں شیشہ کاٹنے اور بیچنے والوں کے بازار کی طرف کھلتی تھیں اور وہ بازار میں ایک دکان کے سامنے پھٹہ لگائے دن کے پورے طول میں شیشہ کاٹ کاٹ کر فریم بناتا دیکھا جا سکتا تھا صبح سے شام تک دو پاؤں پر کھڑا فریم بناتا ہوتا تھا۔

جنازگاہ میں جج صاحب بھی موجود ملے وہ باریش وکیل سے ہائی کورٹ کے جج اور شرعی عدالت تک کے عدل و انصاف کا سفر طے کر چکے تھے اور انہیں بھی ٹیلی فون نے اتنا ہی پیغام دیا تھا جو مجھے دے کر بند ہو گیا تھا نماز ہوئی دعا ختم ہو گئی اور ہم اس کی میت کو کندھا دیئے بنا واپس آ گئے نہ اس کا چہرہ دیکھا نہ قبر پر مٹی ڈالی میری اور جج صاحب کی بھی حالت ویسی ہی تھی جیسی عام طور پر جنازہ پڑھنے کے لمحات میں ہوتی ہے کوئی ایسا دکھ نہ تھا کہ قدم ڈول جائیں اس دن کی موت سے پیدا ہونے والی رات ایک دوست کے اکلوتے فرزند کی مہندی میں شرکت کا سدا تھا زندگی تو قوس قزح ہے مہندی کی خوشی کے بھنگڑے میں سب ہی شامل تھے، بوڑھے بھی اور جوان بھی سب ہی اس دوست کی اکلوتی خوشی میں رات گئے تک ناچتے رہے، بھنگڑا ڈالتے رہے اور میں ایک طرف بیٹھا رہا، خوش ہونے اور خوش خوش دکھنے کی نقالی کرتا رہا تھا اور اس نقالی نے مجھے نڈھال سا کر دیا تھا اور سرد رات کے ناتواں لمحوں میں اچانک ایک دریا کی گرفت میں آ گیا۔

دریا کے اونچے پتھریلے کناروں پر خوش بخت درخت اور پودے تھے بالکل خاموش اور ساکت۔ مضبوط کناروں کے اندر شمال سے جنوب کو بہتے دریا کے اندر پانی میں انسان ہی انسان تھے ہنستے مسکراتے خوش باش انسانوں کو دریا کے رواں پانی نے مضبوطی سے اپنے وجود میں جکڑا ہوا تھا وہ سب بے آواز، بے لہر پانی میں پیوست ایسے رواں دواں تھے جیسے کنویئر بیلٹ پر کھڑے ایک مقام سے کسی دوسری جگہ تک کے سفر میں ہوں اور میں خود بھی ان کے درمیان دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ وقت کی مانند خاموش اور بے لہر دریا کی گرفت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بہے جا رہا تھا کہ آگے ایک گول چٹان آ گئی اس کنارے کی طرف جدھر میں تھا چٹان نے دریا کا آدھا راستہ روک لیا تو میری اور میرے آگے پیچھے والوں کی رفتار مدہم پڑ گئی اور باقی آدھے دریا میں سفر کرنے والوں کی رفتار تیز ہو گئی چٹان آ جانے سے دریا کا سارا پانی اس آدھے تنگ دریا میں بھی خاموش اور بے لہر تھا اور مسافر ڈولنے لگے تھے اور دریا نہایت خاموشی سے ہزاروں فٹ بلندی سے سیدھا نیچے اتر رہا تھا اور بلندی سے اتر کر مشرق سے مغرب کی سمت بہنے لگا تھا اور اوپر سے نیچے تک کے نزول میں دریا کے ہم سفر انسان نابود ہوتے جا رہے تھے ہزاروں فٹ بلند بے آواز آبشار سے آگے مشرق سے مغرب کو رواں دواں دریا میں بہت ہی کم کم انسان نظر آتے تھے کوئی غوطے کھاتا ہوا کوئی ہاتھ پاؤں مارتا ہوا اور کوئی ہانپتا کانپتا ہوا بہت ہی تھوڑے لوگ رہ گئے تھے دریا میں۔ باقی سب کہیں نابود ہو گئے تھے اور ایک نوجوان جو دریا کے درمیان میں انسانوں کے ہجوم میں ناف تک پانی میں پیوست تھا چٹان کی گولائی کی تنگ نائے میں بھی دونوں بازو اوپر اٹھائے ہنستا مسکراتا جا رہا تھا ناف تک پانی میں پیوست دونوں بازو فضا میں لہراتا ہوا ہنستا مسکراتا ہوا۔ اپنے پاؤں کے نیچے کی کنویئر بیلٹ پر قدم جمائے وہ نہ ڈگمگایا تھا اور نہ لرزا تھا تنگ نائے میں بھی اور آبشار کے ہزاروں فٹ کے نزول میں بھی ہانپتے کانپتے ڈوبتے تیرتے اور غوطے کھاتے لوگوں کے درمیان میں بھی۔ نزول سے آگے بے لہر بے آواز دریا میں بھی وہ بہت خوش تھا اور اسی طرح دونوں بازو لہراتا مسکراتا دریا کے پانیوں میں چھپی کنویئر بیلٹ پر کھڑا چلا جا رہا تھا میں نے اس کی شناخت متعین کرنے کی کوشش کی تو خاموشیوں سے بھرپور فضاء میں وہی ''میں حق میں ناحق نہیں ملاتا'' کی آواز گونج گئی

ٹیلیفون کی گھنٹی نے نئے دن کے جنم کا اعلان کیا تو جج صاحب کے لبوں پر ''یہ حق میں ناحق نہ ملانا رزق حلال کو ہی کہتے ہیں؟'' لرز رہا تھا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر فلورنس

ڈاکٹر نزہت اپنے آنسوؤں کے طوفان میں غوطے کھا رہی تھی اور میں بے بس بیٹھا اسے ڈوبتا دیکھ رہا تھا وہ غوطے کھاتی رہی اور میں اپنے ناقابل معافی جرم پر اپنے آپ کو معاف کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ ''خدا کیلئے میری بچی کو خارش سے بچا لیں''، ڈاکٹر نزہت نے ڈوبتے ہوئے منت کی

''ڈاکٹر صاحبہ آپ کی بچی کو آپ کی ضرورت ہے۔ حوصلہ کریں میں پوری کوشش کروں گا'' میں نے کہہ تو دیا لیکن میں جانتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا

میری بے بسی نے ڈاکٹر نزہت کی ممتا کو سہارا دیا تو میری اپنی سانس اکھڑ گئی

ملازم بچی کو کمرے میں واپس لایا تو ماں کے آنسو دیکھ کر وہ بھی اس کی گود میں سر دے کر رونے لگی۔ ممتا نے پھول بچی کی پیشانی چومنا چاہی تو ماں بیٹی کے آنسوؤں کے ملنے سے کمرہ دھند سے بھر گیا اور ڈاکٹر فلورنس قہقہے لگانے لگا

میں کبھی بھی کسی آدمی کو جھوٹا نہیں سمجھتا جب تک کوئی آدمی خود اپنے کو جھوٹا ثابت نہ کر دے میں کسی کو فریبی نہیں مانتا جب تک کوئی اپنی فریب کاریوں کی اصلی سند فراہم نہ کر دے میرے لئے کسی اچھے بھلے چلتے پھرتے فرد کو مریض ماننا بھی بہت دشوار ہوتا ہے اور ڈاکٹر نزہت ایم بی بی ایس، ایف آر سی ایس، رو رو کر اپنی اکلوتی بچی کو خارش سے بچانے کی درخواستیں کر رہی تھی اور میرے لئے اس معصوم کی خوشیوں کو لگی خارش سے انکار ممکن نہیں تھا اور میں اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کو کوسنے لگا تھا کہ میں لوگوں کو جھوٹا، فریبی اور دغاباز کیوں نہیں سمجھتا میں ڈاکٹر نزہت اور اس کی معصوم بچی کا مجرم تھا اور میں نے اس سے اس کی بچی کو خارش سے بچانے کا وعدہ کر لیا تھا اور میں جانتا تھا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گا مگر مجبوری تھی کہ ڈاکٹر نزہت اپنے آنسوؤں کے طوفان میں غوطے کھا رہی تھی

اخبار نویس کا دل دکھوں کا خزینہ ہوتا ہے فقیر کا دکھ، امیر کا دکھ، عوام کا دکھ، حکمرانوں کے دکھ، اس کے دل میں اتنے زیادہ دکھ بھرے ہوتے ہیں کہ اس کے لئے اپنے دل میں کسی اپنی ذاتی خواہش کا کوئی بیج ڈالنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی پھر اس زمانے میں دنیا کو سرخ اور سبز بنانے کا بھی دکھ درد ہوا کرتا تھا اور کسی دشمن نے اخبار نویسوں کے دکھوں میں اضافہ کرنے کو چپکے سے ان کے دلوں میں اپنے گھر بنانے کی خواہش کا بیج ڈال دیا تھا اور دوسروں کے غموں میں تڑپنے پھڑکنے کے وقفوں میں وہ اس پودے کو بھی پانی دینے لگے تھے اور ہمارے اخبار نویسوں میں شامل ہونے تک اس پودے میں مطالبات کی چھوٹی چھوٹی چڑیوں نے گھونسلے بنا لئے تھے اور کسی نبض شناس نے ان چڑیوں کو پلاٹوں کی چوگ ڈال دی تھی اور ہمارے اقبال ٹاؤن کے ستلج بلاک میں گھر بنا لینے کے جرم میں ڈاکٹر نزہت علم وادب کی چتا میں جل رہی تھی اور اس کی پھول سی بچی خارش کی زد میں آ گئی تھی

ستلج بلاک کو جو سڑک جہانزیب بلاک سے جدا کرتی ہے اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے پارک میں ایک دوسرے میں الجھے الجھے سے کچھ درخت دیکھے جا سکتے ہیں اس زمانے میں ایل ڈی اے والے اس میدان میں پودوں کی نرسی اگایا کرتے تھے اور جس کسی نے بھی ارد گرد گھر بنا لیا تھا وہ اپنے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ وہاں پھینکا کرتا تھا اور ارد گرد کے گھروں کے مرغ مرغیاں اس کوڑے کرکٹ میں رزق حلال تلاش کیا کرتے تھے اور جس کسی کا کوئی چھوٹا موٹا بچہ ہوتا تھا وہ بھی وہیں کھیل کود لیا کرتا تھا اور میں صبح سویرے اپنے محل کے سامنے کرسی ڈال کر ان مرغوں، بچوں اور سڑک پر سے گزرنے والے ٹانویں ٹانویں آدمیوں کو دیکھنے کے وقفہ میں اخبار کی ورق گردانی کیا کرتا تھا اور گرما و سرما کی ہر صبح ایک بزرگ مائل شخص، اپنے سر پر لمبوتری سی گرم ٹوپی چڑھائے بغل میں استرے قینچیاں ڈالنے والی کچھی جیسا چھوٹا سا بیگ دبائے سڑک کی سیاہی میں کچھ تلاش کرتا ہوا آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہوتا تھا ان دنوں پورے اقبال ٹاؤن میں کوئی دکان نہیں ہوتی تھی اور جس کسی کو خود اپنی شیو بنانا نہیں آتا تھا یا بال کٹوانا

ہوتے تھے اسے یتیم خانہ یا شاہنور جانا پڑتا تھا اور میں اس کسی کی خوش قسمتی پر رشک کیا کرتا تھا جسے اتنا باقاعدہ نائی میسر آ گیا تھا

ایک صبح میں اپنے محل کے سامنے کرسی میں گھسا اخبار میں وقت کے حکمرانوں کی پروف کی غلطیوں پر سرخ اور سبز دائرے لگا رہا تھا کہ کان میں شہد کی کسی مکھی کی بھنبھناہٹ نے کھلبلی کی۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو وہی بزرگی مائل سے کچھی بردار سر جھکائے سامنے جھکے کھڑے تھے۔ شدید گرمی میں سر پر لمبوتری سی گرم ٹوپی چڑھائے اور بغل میں استرے، قینچیوں والی کچھی دبائے اس بزرگ نما کو دیکھ کر مجھے کافی فرحت سی محسوس ہوئی۔ ایک بار پھر سلام کی بھنبھناہٹ پیش کر کے اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو اس کا گول گپا دہانہ باچھوں تک کھل گیا۔ ''میری خوش بختی ہے کہ آپ کے درشن نصیب ہو گئے۔ میں مدت سے آپ کو پڑھ رہا ہوں۔ آپ جیسا بیباک اور بہادر لکھنے والا اس دور میں اور کوئی نہیں۔ آپکی عظمت کو سلام کرنے کی شدید خواہش تھی۔ پروگرام بنا کر توڑ دیتا کہ آپ کا وقت ضائع نہ ہو۔ آپ کا وقت تو اس قوم بلکہ ملت اسلامیہ کی امانت ہے۔ آج دیدار کی خواہش کی شدت سے مغلوب ہو گیا امید ہے آپ میری اس گستاخی کا برا نہیں مانیں گے''

''آپ۔۔۔۔؟''

''جی میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں اس پچھلی والی گلی میں آپ کی عظمت کے سایہ میں''۔

''تشریف رکھیں میں۔۔۔۔''

''آپ کا کرم ہے آپ نے اس قابل جانا اللہ آپ کی عمر اور سایہ دراز کرے''

وہ میرا کوئی فقرہ پورا ہی نہیں ہونے دیتا تھا

''مگر آپ۔۔۔۔''

''جی مجھے ڈاکٹر فلورنس کہتے ہیں بس ویسے ہی جھک مار لیتا ہوں، ادبی رسالوں میں کبھی کبھار آپ نے بھی کہیں پڑھا ہوگا، میری خوش قسمتی کہ آپ کے درشن ہو گئے'' اس نے کہا اور سڑک کی سیاہی میں کچھ تلاش کرتا ہوا واپس چلا گیا

میں نے اپنی کرسی سرکا کر اپنی عظمت کی چھاؤں میں کر لی۔ مجھے اپنی عظمت کی چھاؤں اچھی لگنے لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے ناکردہ جرم کا آغاز ہو گیا تھا

اخبار کے دفتر میں بہت سی چیزیں بن مانگے بھگتنا پڑتی ہیں خبریں، سازشیں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشامدیں، نذریں نیازیں، لیڈر، شاعر، ادیب، مولوی، اخبار، رسالے اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وقت کی تیزی سے مقابلے کی دوڑ میں چاہیں بھی تو ان سب نعمتوں سے اچھی طرح لطف اندوز ہونا ممکن نہیں ہوتا پھر بھی میں ضمیر عصر کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے کی خاطر ادبی رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیا کرتا تھا اور ڈاکٹر فلورنس مجھے جانا سا نام محسوس ہوا تھا اور یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر فلورنس کوئی خاتون ہیں۔ زندگی کی خوشگواری بہت سی غلط فہمیوں پر استوار ہے اور میں نے اپنی کرسی اپنی عظمت کی خوشگواری میں گھسیٹ لی تھی

پھر میرے گھر پر بھی ایک ادبی رسالہ مفت میں آنے لگا اس رسالے میں ادبی ادب کم کم اور رسالے کے ایڈیٹر کا ادب بہت زیادہ ہوتا تھا رسالے کے نثری حصے میں ڈاکٹر فلورنس چھائے ہوتے تھے خطوط کے حصہ میں لمبے لمبے خط آدھے ایڈیٹر کی تعریف میں اور باقی آدھے ڈاکٹر فلورنس کی وسعت مطالعہ، ان کی ادبی چستی اور پھرتی، تنقیدی دیانت اور امانت کی تعریفوں سے بھرے ہوتے تھے ضمیر عصر کے ڈاکٹر فلورنس کی عظمت کی تسبیح پڑھنے کا اثر ہو گا کہ میرے دل میں بھی ان کی عظمت کے پاؤں جمنا شروع ہو گئے

بچپن میں ہمیں رس بھرے لسوڑے توڑ توڑ کر کھانے کا بہت شوق ہوتا تھا مگر لسوڑے کی ایک گڑھک سارا مزہ خراب کر دیا کرتی تھی اچھا لگنے کے باوجود ڈاکٹر فلورنس بعض دفعہ مجھے بہت ہی برے لگنا شروع ہو جاتے تھے، لسوڑے کی لیسدار گڑھک جیسے مگر محلہ داری کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں اور ہماری اس نئی بستی میں مجبوریاں زیادہ اور آسانیاں کم کم ہوتی تھیں وہاں نہ کوئی حجام ہوتا تھا نہ مالشیہ ملتا تھا اور ہمارا خاندانی مراثی بھی کبھی کبھار ہی چکر لگایا کرتا تھا اور اللہ کی ساری مخلوق میں ڈاکٹر فلورنس میری ذاتی عظمت سے سب سے زیادہ آگاہ تھے اس لئے وہ مجھے اچھے زیادہ اور برے کم کم ہی لگا کرتے تھے

مجھے محنتی لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور ڈاکٹر فلورنس بہت ہی زیادہ محنتی تھے میں نوجوانوں کو ان کی محنت مشقت کی مثال پیش کرتا ''اگر ہم لاہور سے براستہ سرگودھا خوشاب جانے والی سڑک کے کنارے کنارے ایک ساتھ ملا ملا کر لاہور سے خوشاب تک ''محنتی'' لکھتے جائیں اور پھر اسی طرح سڑک کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ 'محنتی! محنتی' لکھتے ہوئے خوشاب سے براستہ سرگودھا لاہور بلکہ اقبال ٹاؤن کے سٹلج بلاک واپس آ جائیں تو بھی اس ''محنت'' کی لمبائی ڈاکٹر فلورنس کی محنت سے کم ہو گی'' انہوں نے کسی جاگیردار کے ڈیرے سے

محنت شروع کی تھی اور براستہ کلرکی اچھی بھلی افسری تک پہنچ گئے تھے۔ قلم اور زبان کی محنت کے ذریعے میٹرک پاس بابو سے ایم اے پی ایچ ڈی ڈاکٹر فلورنس بن گئے تھے۔ فراعنہ مصر کے احرام کے لئے پتھر اٹھا اٹھا کر لانے والوں میں بھی ایسے محنتی اور مشقتی افراد بہت ہی کم ہوں گے مشقت کے احرام اکبر کی بلندی کو چھو لینے کے باوجود ڈاکٹر فلورنس اپنے اس محسن جاگیردار کی خدمت کو دین و دنیا میں نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے اور شعر و ادب کی روح عصر سے جرمانہ اور جزیہ وصول کر کر کے اس کے حضور پیش کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جس مٹی سے ڈاکٹر فلورنس کا قلبوط بنایا تھا اس کا ایک ذرہ بھی اولاد آدم میں سے کسی کے قلبوط میں نہیں ملایا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنے کسی حاضر و ناظر افسر یا اس رسالہ کے ایڈیٹر کی تعریف یا کارکردگی کے بارے میں خبر چھپوانے آتے تو ہم بخوشی چھاپ دیتے۔ اخباروں میں ہر روز پندرہ سولہ صفحات حکمرانوں، سیاستدانوں، چوروں ڈاکوؤں کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔ کبھی ایک آدھ ایسی خبر چھپ جانے سے ہمیں اور ہمارے اخبار کو کیا فرق پڑتا تھا اور اس ''کرم'' سے ڈاکٹر فلورنس اور میں خود میری عظمت سے اور بھی اچھی طرح آگاہ ہوتے جا رہے تھے

ایک شام خبروں کی برسات کے لمحوں میں ایک باریش بزرگ تشریف لائے۔ سفید آراستہ داڑھی، روشن روشن آنکھیں، پیشانی پر محراب اور غیر خبری اطوار بات کرتے تو محسوس ہوتا لفظوں کا احترام ماں کی گود سے سیکھا ہے۔ ماں کی گود زندگی بھر آدمی کے ساتھ رہتی ہے۔ کرم علی کی نظریں تو بزرگ کے چہرے میں جم ہی گئی تھیں ''میں ڈاکٹر بخاری ہوں پڑھنے پڑھانے سے وابستہ ہوں آپ سے چند منٹ مستعار لینا چاہتا ہوں''

''فرمائیں'' میں نے کرم علی کو چائے کا اشارہ کیا

''آپ محترم ڈاکٹر فلورنس صاحب کو کس قدر پہچانتے ہیں''

میں سوچنے لگا جاننے اور پہچاننے کی حد امتیاز عبور کرنا مشکل ہو رہا تھا ''تھوڑا سا''

''اپنے احباب کے حوالے سے کیسے انسان ہیں؟''

''ضمیر عصر کی آواز تو ان کی تعریفوں سے بوجھل ہی ہوتی ہے''

''اور ان کا بیٹا جو ڈاکٹری پیشہ ہے''

''باپ پر ہی ہونا چاہیے وہ جو کہتے ہیں ماں پر دھی پتا پر گھوڑا''

وہ مسکرائے ''گھوڑے کی ٹانگوں کی تعداد کا بھی لوگ خیال نہیں کرتے''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے خفت سی ہوئی اپنے بے دھیان ہو جانے پر وہ تو ہر لفظ کا احترام کرتے تھے کرم علی نے چائے سجادی تھی وہ ہر گھونٹ سے پہلے بسم اللہ پڑھتے تھے۔

وہ ''شکریہ'' کا بوجھ ڈال کر چلے گئے تو کرم علی نے سرگوشی کی ''میں نے آج تک چائے کا اتنا احترام کرنے والا بندہ نہیں دیکھا''

''چائے کا نہیں بخاری صاحب تو تمہارا احترام کر رہے تھے''

کرم علی مسکرا کر برتن سمیٹنے لگا۔

ولیمہ کی دعوت میں دونوں ڈاکٹر بہت خوش تھے ڈاکٹر بخاری بار بار میرا اور کرم علی کا شکریہ ادا کرتے رہے اور ڈاکٹر فلورنس انہیں بھی میری عظمت کی چھاؤں میں بسر کرنے کو اپنی مصروفیت سے کچھ وقت نکالنے کا مشورہ دیتے رہے۔

اپنی عظمت کی چھاؤں میں لیٹے لیٹے ایک روز میں نے اپنا ذاتی ہفت روزہ رسالہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور اخبار چھوڑ کر ایک ادارہ بنا لیا اس فیصلہ پر جو کوئی سب سے زیادہ خوش ہوا تھا وہ ڈاکٹر فلورنس تھا مبارکبادوں کی گٹھڑی کے ساتھ وہ مٹھائی کا بھی بڑا سا ٹوکرا لائے تھے اور ان کی دلی خوشی کے ان کے چہرے پر پاؤں نہیں جم رہے تھے۔ ''یہ فیصلہ آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا لیکن جو ہوا ہو گیا اب بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی آپ کا یہ بوڑھا خادم ہر خدمت کے لئے حاضر ہے آپ اسے کسی نوجوان سے پیچھے نہیں پائیں گے''۔ ایک روز وہ ڈاکٹر بخاری، ان کی بیٹی اور اپنی بہو ڈاکٹر نزہت کو بھی مبارکبادوں سے مزید بوجھل کرنے میرے گھر لے آئے ڈاکٹر نزہت ادب آداب میں اپنے والد سے بھی بزرگ تر تھیں۔ باپ نے تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کو شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق جہیز میں دیا تھا۔ میری بیوی کئی روز تک ڈاکٹر فلورنس کے خانوادے کی خوش بختی پر رشک کرتی رہی۔ ڈاکٹر فلورنس نے اس روز بھی انہیں میری عظمت، جرات، بیباکی اور پیشہ وارانہ مہارت سے مرعوب کرنے میں بہت محنت کی۔

اپنا ذاتی رسالہ نکالنا دوستوں، پیاروں اور پاؤ صدی کی پرستاروں کو ایک بالکل ہی نئی روشنی میں دیکھنے کی سنگین غلطی ثابت ہوئی۔ جو لوگ دیکھے بن جی نہیں سکتے تھے وہ دیکھ کر راستہ بدلنے لگے۔ آزمائش کے اس مرحلہ مین جس پرستار نے ساتھ نبھایا وہ ڈاکٹر فلورنس تھے۔ مضامین ایڈٹ کرنے سے سرخیاں نکالنے اور پروف ریڈنگ تک انہوں نے بہت سے

کام خود ہی اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ وہ انگریزی مضامین کا اردو میں بہت اچھا سلیس اور رواں دواں ترجمہ کرتے تھے۔ میں روکتا تو وہ جواب دیتے ''آپ کا نہیں میں تو اپنا ذاتی کام کرتا ہوں'' میں ان کے تعاون اور احسان کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا کہ ایک روز وہ ایک کالم بھی لکھ لائے۔ بڑے بڑے ادیبوں اور نامور شاعروں کی سازشوں اور ہیرا پھیریوں کو بڑے ماہرانہ انداز میں بے نقاب کیا گیا تھا۔ واہ! واہ! بہت اچھا ادبی کالم تھا رسالہ تو سیاسی تھا مگر ڈاکٹر فلورنس کے پرخلوص تعاون اور کالم کے وزن کی وجہ سے ہم نے اسے ادب کا ٹرکا لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر فلورنس کی نثر بہت اچھی تھی۔ ہیرا پھیریوں اور سازشوں کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ کالم چھپتے ہی ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ ملک کے کونے کونے سے تعریفی خط آئے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسرار تھا کہ ہمیں وہ سب خط چھاپ دینا چاہیے مگر میں اپنی اور اپنے رسالے کی تعریف میں آئے خط اپنے ہی رسالے میں چھاپنے کے حق میں نہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے بندہ اپنے گلے میں ڈھول ڈال کر بھرے میلے میں اپنی دونی پیٹ رہا ہو'' بہنوں نے بھراؤ! رسالے والا آ گیا جے! لافانی تے لاثانی ایڈیٹر جس جیسا نہ پہلے ہوا نہ آگے ہو گا۔ دندتے داڑھ نکلوالو! جو بھی رسالہ پڑھے گا دونوں جہانوں کے غموں سے نجات پا جائے گا۔ اٹاں تے وٹے رسالہ آئے تے دکھ مٹھے۔۔ بلے بلے بلے بلے!'' مجھے اخبار نویس سے پرائی بننا پسند نہیں تھا۔ ڈاکٹر فلورنس کی تجویز پر ہم نے ان کا کالم باقاعدہ کر دیا تو پورے ملک سے تعریفی خط برسنا شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر فلورنس ہمارے رسالہ میں فرضی نام سے کالم لکھتے تھے اور کراچی کے ایک اخبار کے لئے لاہور کی ادبی ڈائری بھی لکھا کرتے تھے اور ہمارے رسالے میں لکھے اپنے کالم کی اپنی اس ادبی ڈائری میں بہت تعریف لکھا کرتے تھے اور شاعروں اور ادیبوں کی ہیرا پھیری کی اپنی ہی لکھی تفصیل ہمارے رسالہ کے حوالے سے اپنی ڈائریوں میں دہرا کر آخر میں ایک فقرہ لکھ دیا کرتے تھے'' ہے اس ملک میں کوئی اور ایسا بہادر اور بیباک ایڈیٹر جو قوم کا ضمیر ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کو اتنی جرات سے بے نقاب کر سکے''

ایک روز ڈاکٹر فلورنس اپنی ایک ''بہن'' کو بھی لے آئے اس عفیفہ نے بھی ایک ادبی سلسلہ شروع کر دیا تو ان کے بہنوئی بھی اس خدمت میں شامل ہو گئے وہ تینوں ضمیر عصر کی پرشور آواز تھے۔ ملک کے ادبی حلقوں میں کافی جانے پہچانے جاتے تھے اور تینوں ہی میری اور ادب کی بلا معاوضہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے تو یرغمال ہی بنا لیا تھا کہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روز میرے نائب نے خبر دی ''ڈاکٹر فلورنس کی تو ایک ہی آنکھ ہے دوسری آنکھ سے تو اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا''۔ اس نے ڈاکٹر فلورنس کے ہیرا پھیری کالموں کی فائل میرے سامنے رکھ دی۔ میں تو ان کے کالموں کے تعریفی خطوط ہی دیکھا کرتا تھا۔ کالم دیکھنا اور چھاپنا نائب کے ذمہ ہوتا تھا ''ڈاکٹر فلورنس ایک ہی گروپ کی ہیرا پھیریاں دیکھ سکتے ہیں اس ایک گروپ میں انہیں ہیرا پھیری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور دوسرے گروپ کے فضائل کے بیان میں بہت مشقت سے کام لیتے ہیں ہم تو اس گروپ گشتی میں فریق نہیں بن سکتے''

اس کا خیال تھا کہ وہ تینوں بہن بھائی مجھے شہنشاہ صحافت بنا کر اپنی اپنی لڑائیاں لڑ رہے ہیں'' میں نے ان سے کئی بار درخواست کی ہے کہ وہ توازن پیدا کریں اور دوسرے گروپ کی سازشوں اور ہیرا پھیریوں کا بھی ذکر کیا کریں مگر وہ تو میری کوئی بات ہی نہیں مانتے ڈاکٹر فلورنس تو سانس بھی ناک کی بجائے کسی اور سوراخ سے لیتے ہیں''

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ مسکرائے ''ڈاکٹر فلورنس کو پڑھنے کے لئے مجھے تو ناک پر رومال رکھنا پڑتا ہے آپ خود پڑھ کر دیکھ لیں''

ڈاکٹر فلورنس نے دوسری آنکھ سے دیکھنے سے انکار کر دیا تو میرے ساتھی نے معذرت کر لی ان کی بہن اور بہنوئی نے بھی لکھنا بند کر دیا۔ ایک دو ادبی کالموں میں ہمارے اس اقدام پر دکھ کا بھی اظہار کیا گیا۔ ایک آدھ نے لکھا کہ ہم نے اوپر کے دباؤ اور لالچ میں حق سچ کی آواز دبا دی ہے جو پہلے ہماری بہادری اور جرات کا کالم بھرا کرتے تھے۔ انہوں نے بزدلی کے طعنے دیئے، ہم خاموش رہے

چند ماہ بعد ڈاکٹر فلورنس سرکاری گرانٹ پر چلنے والے ایک ادبی ادارے سے منسلک ہو گئے۔ اس ادارے کے سربراہ کی توصیف میں وہ ہمارے رسالہ میں کالم بھرا کرتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے سرکاری خرچ پر ملک کے ادبی اور غیر ادبی رسائل کے بارے میں ایک تحقیقی رپورٹ تیار کر کے کتابی صورت میں چھاپ دی اس رپورٹ میں ہمارے رسالے کا انہوں نے ذکر تک نہیں کیا تھا اور ڈاکٹر نزہت نے میرے سامنے جو فائل رکھی تھی اس میں محفوظ خطوط میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوا تھا اور ڈاکٹر فلورنس کے اسرار کے باوجود میں نے وہ خط اپنے رسالہ میں نہیں چھاپے تھے'' میں اور امی جی مختلف ناموں سے آپ کے نام یہ خط لکھا کرتی تھیں اور مختلف سٹیشنوں سے خط پوسٹ کروانے کا بندوبست ڈاکٹر فلورنس کیا

کرتے تھے''

میرا سر چکرانے لگا

ڈاکٹر نزہت نے فائل اٹھالی'' رپورٹ کے بعد اس والے ادارہ میں کوئی کام نہیں تھا ان کراچی والوں نے بھی ابا جی کا کالم بند کر دیا ہے اور ہمارا گھر دوزخ بن گیا ہے جب وہ آپ کے ہاں لکھتے تھے تو گھر ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا ٹیلیفون سنتے ہی خوش باش ہو جاتے تھے اب صبح کی نماز کے بعد ٹیلیفون کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اگر کوئی میرا رشتہ دار یا سہیلی ٹیلیفون کر دے تو ریسیور اٹھاتے ہی اپنے سر سے ٹوپی اتار کر دور پھینک دیتے ہیں اور انہیں خارش کا دورہ پڑ جاتا ہے سر سے پاؤں تک جسم کے ہر ظاہر اور باطن حصہ پر اتنی شدید خارش محسوس کرتے ہیں کہ بتا نہیں سکتی گھر میں سب کی شامت آئی رہتی ہے امی جی تو کچن سے ہی باہر نہیں آتیں وہ بے چاری بھی اس بڑھاپے میں ابا جی سے ڈرنے لگی ہیں خدا کے لئے میری اس بچی کو اس خارش سے بچالیں'' وہ پھر رونے لگی

''مگر ڈاکٹر نزہت اس بچی کا ڈاکٹر فلورنس کی خارش سے کیا تعلق''

''جی ہے، اس معصوم کی خوشیوں کا ابا جی کی خارش سے بہت گہرا تعلق ہے ہمارا سارا گھر ان کی خارش کی زد میں آ گیا ہے خدا کے لئے اس معصوم کو اس کے دادا کی خارش سے بچالیں اور کہیں ان کا کالم شروع کرا دیں''

بچی ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر رونے لگی۔ ممتا کے آنسو معصومیت کے آنسوؤں میں ملنے سے سارا کمرہ دھند سے بھر گیا اور میرا سر چکرانے لگا میں اپنے جرم پر اپنے کو کوسنے لگا تھا اور ڈاکٹر فلورنس قہقہے لگا رہا تھا گھٹنی چیختی رہی میں سر جھکائے بیٹھا رہا اور ڈاکٹر نزہت اپنے آنسوؤں کے طوفان میں غوطے کھاتی رہیں۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکوں گا ''ڈاکٹر نزہت میں اس معصوم کو ڈاکٹر فلورنس کی خارش سے بچانے کی پوری کوشش کروں گا'' میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا

ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر بخاری آئے ہیں تو ڈاکٹر نزہت نے پہلے اس کی طرف اور پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں وہ کیوں آئے ہیں؟ انہیں آپ نے کیوں بتا دیا؟ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور نارمل دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگی

ڈاکٹر بخاری نڈھال تھے وہ صوفے میں گر ہی پڑے ان کی سانس اکھڑنے لگی''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تو! تمہارا اور بچی کا احوال دیکھنے آیا تھا اس نے مجھے گالیاں دی ہیں ڈاکٹر فلورنس نے اس ڈاکٹر نے مجھے گالیاں دی ہیں کسی نے نام پوچھ کر دروازہ کھولنا چاہا تو پیچھے سے وہ مجھے گالیاں دینے لگا مجھے کیا معلوم نزہت ادھر کیوں آئی ہے میں تو اس کے گھر گیا تھا اس کا احوال جاننے"

"آپ کو غلطی تو نہیں لگی؟ ہوسکتا ہے وہ ڈاکٹر فلورنس نہ ہوں"

"میں نے غلطی کی ہے بہت بڑی غلطی کی ہے اس عصر کے ضمیر کی آواز پہچاننے میں تو مجھ سے غلطی ہوگئی ہے مگر ڈاکٹر فلورنس کی آواز پہچاننے میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی وہی تھا"

ملازم نے پانی کا گلاس پیش کیا تو ڈاکٹر بخاری پانی میں کچھ تلاش کرنے لگا "بہت ذلیل ہے! اس زمانے کا تو لفظ بھی بہت ذلیل ہوگیا ہے آج کا لفظ تو پڑھنے والے کو اپنے لکھنے والے کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاتا"

میں نے ڈاکٹر بخاری کے زخمی لفظوں کی دھند میں پناہ لینا چاہی تو اس میں بھی کہیں ڈاکٹر فلورنس قہقہے لگا رہا تھا

☆☆☆☆☆

توہین

پوہ کی بارش میں نہائی بہت ہی سرد رات کا جوبن ڈھلے ہم آخری خبر فائل کر کے دفتر سے نکلے تو لاہور کی زندگی کے آثار نایاب تھے۔ شاہراہ قائد بیابان ہو رہی تھی اس کے فٹ پاتھوں کے سینوں میں پیوست بوڑھے درختوں کی شاخیں ایک دوسری کے گلے میں بانہیں ڈالے کانپ رہی تھیں جی این مرزا کے قہقہوں کا کوٹا ابھی پورا نہیں ہوا تھا اور اس کی اس روز کی کہانیوں کے بقیہ ہمارے ہم قدم چل رہے تھے۔ جی این مرزا بہت سالوں سے ایک ہی بیٹ کر رہا تھا اور انصاف کے اونچے نیچے ایوانوں کی بیٹ میں کافی گہرائی تک اتر گیا تھا۔ وہ انصاف کے ایوانوں اور ان کی آقا و غلام گردشوں سے بڑی دلچسپ داستانیں چرالاتا تھا اور ان داستانوں کے توہین عدالت کے زمرے میں آنے والے حصے زبانی سنا سنا کر قہقہے لگایا کرتا تھا "ف کے بیٹے کو تو اپنے باپ سے انصاف کا جنازہ پڑھوانے کی بکنگ سے ہی فرصت نصیب نہیں ہوتی" اس نے دوسری کہانی کا بقیہ شروع کر کے اور بھی زوردار قہقہہ لگایا۔ عدالت عالیہ کے ایک نامی گرامی نیک نامی قسم کے جج کی انصاف کی سربلندی کی طبعی عمر پوری ہو رہی تھی اور مرزا اس کی خبر کا "میں تو نئی گاڑی ہی لوں گا" کا بقیہ سنا رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا۔ سٹیٹ بنک کی منزل پر سوار منزل والی عمارت کی کسی اوپر والی منزل سے ٹکرا کر اس کا ایک قہقہہ واپس لوٹا تو خوفزدہ اُلوؤں کی جوڑی کسی بوڑھے پیپل کی شاخوں کی آغوش سے اڑ کر چیختی چلاتی عدل کے لحاف میں انصاف کے خراٹے لیتی بے روح عمارت کی سب سے اونچی ممٹی پر جا بیٹھی "مرزا بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چارے اُلوؤں پر ہی کچھ رحم کریں'' نورنواز فدائی نے ان کی عدالت میں درخواست گزاری۔
''اُلوؤں نے کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟'' مرزا نے ان کی درخواست مسترد کرتے ہوئے اور بھی زوردار قہقہہ لگایا۔

رات کے جھوٹ اور منافقت سے پاک اس حصہ میں ہم سیاست، حکمرانی، انصاف، جرائم اور ادب شدب کی کہانیوں کے ناقابل اشاعت حصے سنتے سناتے پرانی انارکلی تک پیدل جایا کرتے تھے اور کسی شب بیدار کھوکھے کے پھٹوں پر بیٹھ کر چائے کی ایک ایک پیالی میں ملا کر وہ سب بقیہ ختم کر کے اہل مسجد کے ہوش میں آنے سے پہلے پہلے اپنے اپنے گھونسلوں کی راہ پکڑ لیتے۔ عدالت عالیہ کا عدل تولنے والا ترازو چوم کر مرزا کا تازہ قہقہہ سرد رات کے منجمد سکوت کی سرنگ میں پوری طرح واپس بھی نہیں پہنچا تھا کہ کرائم رپورٹر کی تیز نگاہیں انصاف کی محافظ دیوار کے پاؤں سے چمٹے فٹ پاتھ کے سینے میں پیوست پیپل کے قدموں میں جم گئیں ''مرزا جی کامریڈ تو چلے گئے'' اس نے کانپتی سی آواز میں خبر دی

رات کے ان لمحوں میں کامریڈ سے ہمارا ٹاکرا فٹ پاتھ پر ہی ہوا کرتا تھا۔ مسجد شہداء اور ٹی ہاؤس کے درمیان کسی جگہ کامریڈ اس انداز میں پھونک پھونک کر قدم جماتا چلا آ رہا ہوتا تھا جیسے فٹ پاتھ پر انقلاب کی چاندنی بچھی ہو۔ سرد اور گرم موسموں میں اپنے چھوٹے سے سر پر اسی قسم کی بڑی سی ٹوپی جمائے جیسی برفیلے موسموں میں ماسکو کے ریڈ سکوائر میں ڈیوٹی دینے والے ریڈ گارڈز کے سروں پر ہوتی تھی، پھٹے پرانے کپڑوں میں چھپا نحیف و نازار کامریڈ اس وقت تک ٹی ہاؤس کی بیرونی کھڑکی کے سامنے کونے والی کرسی پر خاموش بیٹھا رہتا جب دروازے بند کرنے والے اسے وقت کی تیز رفتاری سے آگاہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ٹی ہاؤس سے نکل کر وہ کسی پول کے سرے پر چمکتی ٹیوب کے نیچے جیب سے چرس بھرا سگریٹ نکال کر اس کی پوری لمبائی پر زبان سے ہلکی ہلکی لعاب مالش کرتا۔ اس کے سرے بدل بدل کر لبوں سے لگاتا اور پھر ایک سرے کو آگ دکھا کر دوسرا ہونٹوں میں دبا لیتا اور سمت کا درست تعین کر کے فٹ پاتھ پکڑ لیتا اور مرزا اسے دیکھتے ہی ''کامریڈ آ گیا انقلاب آ گیا! انقلاب آ گیا بے حساب آ گیا'' کا نعرہ لگا کر ناچنا شروع کر دیتا۔

کامریڈ جہاں ہوتا وہیں پاؤں جما کر اپنی جملہ قوت گویائی جمع کر کے اتنی ہی شدت سے نعرہ لگاتا ''آئے گا آئے گا انقلاب آئے گا'' اور مرزا کو امریکی ایجنٹی کا ایک اور سرٹیفکیٹ عطا کر

دیتا۔
مرزا کا قہقہہ دم توڑ گیا وہ تیزی سے آگے بڑھا ''کامریڈ! کامریڈ!''
''ٹھیک ہے دور بہت ہے، وہ دفتر بند ہو گیا، بارش تھی، تھک گیا ہوں!'' وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا
''یہ تو کوئی الگ کیس ہے'' مرزا اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''ٹھیک ہے، بارش ہو گئی، دفتر بند تھا، جا رہا ہوں، آپ فکر نہ کریں'' لفظ اس کے ہونٹوں پر ہی جمتے جا رہے تھے

مرزا انصاف عالیہ کی حفاظتی دیوار سے لپٹے فٹ پاتھ پر بے سدھ پڑے اس کیس کو سہارا دے کر بٹھانے لگا جو بادامی باغ کے لاڑی اڈہ سے بارش میں بھیگتا پیدل چلتا چلتا بند ہو چکے کسی دفتر کے دروازے پر دستک دے آیا تھا۔ مرزا نے بادامی باغ سے اس دفتر کا فاصلہ ناپ کر میلوں لمبی آہ کھینچی ''یہ کیس نپٹانا لازم ہے بارش ہو گئی تو۔۔۔۔۔'' اور فقرہ نامکمل چھوڑ کر فیصلہ سنایا ''آپ چلیں میں کچھ کرتا ہوں''

کرم علی مرزا کے سامنے پیالی جما کر شرارتی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے ''جج صاحب چائے'' کہتا تو مرزا ٹھیک ہے کے انداز میں سر ہلا کر مسکرا دیا کرتا تھا اور رپورٹنگ روم میں ان کی دلیل کو غور سے اور فیصلوں کو احترام سے سنا جاتا تھا ہم نے ان کے اس مختصر فیصلے کے سامنے بھی سر جھکا دیئے اور انہیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر سردی کی سرنگ میں قدم چلاتے آگے چل پڑے۔

سورج نے سیاہ بادلوں کی دریدہ چادر کے شگافوں میں سے اہل زمین پر مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ عدل کے ایوانوں میں انصاف کا دھندا شروع ہو چکا تھا اور بہت سے قانون پیشہ حضرت شاہ چراغ کے مزار کے احاطے میں جمع تھے۔ قانون پیشہ، منشی پیشہ اور کلرک پیشہ بہت سے پیشہ ور وہاں جمع ہو رہے تھے اور ان کے درمیان میں عدالت عالیہ کے ایک سابق ہو چکے چیف بھی کھڑے تھے اس دن ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے شہدائے کراچی ہال میں انسانی حقوق کی مزید سربلندی کیلئے کوئی سیمینار تھا۔ یہ سب وہی لوگ انسانی حقوق کا کیس خلوص خالص سے نپٹانے کا عہد کرنے مسجد جا رہے ہوں گے۔ اس شبہ کی زد میں راستہ بدل کر میں بھی ان میں جا گھسا مگر وہ تو بہت غصہ میں تھے اور مسجد شاہ چراغ کا نوکیلی داڑھی والا موذن سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھکائے ان کے درمیان خاموش کھڑا تھا اور اوقاف پیشہ علمائے دین و دنیا میں سے جو کوئی بھی اس پر غصہ ناراضگی کے اظہار کے گریڈ میں تھا اپنا فرض ادا کر رہا تھا اور مجھے ان قسم قسم کے پیشہ وروں کے مشترکہ غصہ کی وجوہ نہیں مل رہی تھیں حضرت شاہ چراغ کے مزار کے گرد پھیلی سبز پوش قبروں سے احترام کے فاصلے پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سب مسجد کے صحن کی طرف چلنے لگے تو بھی نوکیلی داڑھی والے موذن نے سر نہ اٹھایا صحن سے ہوتے ہوئے محراب کے بائیں کونے میں پہنچ کر وہ سب خاموش ہو گئے۔ میں ان سے فاصلہ پر کھڑا سارے ماجرا کو ناپ تول رہا تھا کہ عدالت عالیہ کے سابق ہو چکے چیف نے موذن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصر فیصلہ سنایا ''یہ سارا قصور اس داڑھی والے کا ہے''

جملہ سران کے فیصلہ کے احترام میں جھک گئے سب سے موٹے اوقافی عالم نے اس فیصلہ کی تائید میں فتویٰ جاری کر دیا اور پھر وہ سب نوکیلی داڑھی والے موذن کو وہیں سر جھکائے خاموش کھڑا چھوڑ کر اپنے اپنے فرائض بجانے کی راہ چلے گئے

مسجد کے کونے میں اوقاف کی خوبصورت دریوں میں لپٹا کوئی اجنبی اوقاف کی اجازت کے بغیر ہی مرا پڑا تھا اور وہ سب مسجد کے موذن کو مرنے والے کے اس جرم کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس پر غصہ کا اظہار کرتے رہے تھے اور ان سب کے جا چکنے کے بعد بھی وہ سر جھکائے مجرم کے سرہانے خاموش کھڑا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے جیسے وہ ان گزر گئے وقتوں کی روح کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھ رہا ہو جب حضرت شاہ چراغ کے مزار اور شرف النساء بیگم کی بنوائی اس خوب سیرت مسجد کا اونچی اونچی بدفطرت عمارتوں نے گھیراؤ نہیں کیا ہوتا تھا۔ دین پیشہ اوقاف شاہی کا بوجھ اور حجم ناقابل گنجائش ہونے لگا تو انہیں ٹھکانے لگانے کو محکمہ اوقاف نے حضرت شاہ چراغ کے مزار اور شرف النساء بیگم کی مسجد کے گرد اونچی اونچی بدصورت اور بدفطرت عمارتیں اٹھوا دی تھیں اور جس کسی کا ہاتھ اس بدفطرت اونچائی تک پہنچ سکتا تھا اس نے ان میں دفتر اور قبضہ جما لیا تھا اور موذن بڑے بڑے وزنی اوقاف پیشہ اور انصاف پیشہ کی زد میں آ گیا تھا۔ ''زندگی میں اس نے پتہ نہیں کبھی نماز پڑھی تھی کہ نہیں اور مرنے کو اس کے لئے مسجد ہی رہ گئی تھی'' اس نے اپنا غصہ بلا اجازت مرجانے والے پر نکالنے کو ہونٹ ہلائے

اخباری رپورٹروں کی بھید پھرولنے اور راز جاننے کی بری عادت انہیں ہمہ وقت

بے چین رکھتی ہے اسی بے چینی اور پریشانی میں میں انسانی حقوق کی سربلندی بھول گیا تھا اور اوقاف کی رنگین دریوں میں لپٹے مسجد کے کونے میں بلا اجازت مرے پڑے اجنبی کے اوپر سے ایک ایک کر کے دریاں ہٹانے لگا نوکیلی داڑھی والا موذن خاموش کھڑا رہا اس کے ہونٹ ہلنا بند ہو گئے تھے۔ آخری دری ہٹاتے ہی غصہ اور ناراضگی نے مجھے بھی چپھی ڈال لی اوقاف کے مجرم نے جی این مرزا کا قیمتی اوورکوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اس کے سر کے بال مرزا کی گرم ٹوپی میں چھپے ہوئے تھے اور چہرے کی جھریوں کی پہنائی میں پیوست داڑھی کے لمبے لمبے سفید بال سینے پر بکھرے ہوئے تھے اور سفید بیضوی چہرے پر جمی ہوئی موٹی سی ناک بڑی بڑی مونچھوں کے درمیان میں بھی نمایاں تھی اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر نماز کے انداز میں باندھے ہوئے تھے غم و غصہ کی بدحالی میں جی این مرزا کو ایس ایم ایس بھیج کر میں اس کے سینے پر بندھے ہاتھ کھولنے کی کوشش کرنے لگا اس نے مر کر بھی کاغذات کا تھیلہ اس قدر مضبوطی سے سینے سے لگا رکھا تھا کہ نوکیلی داڑھی والے موذن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی

چوہدری چراغ دین کا کیس سپرد لحد کر کے واپس آیا تو مرزا کی وحشت زدہ آنکھوں میں فروغ دہشت گردی کی عدالت لگی تھی۔ کرم علی نے پیالی جما کر اپنی غیر محسوس آواز میں ''جج صاحب چائے'' کی خبر دی تو ''دفعہ ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے'' کی گونج دفتر کی راہداریوں میں کافی دیر تک گھومتی پھری جج صاحب نے ایسی فوری اور سخت سزا کبھی کسی کو نہیں سنائی تھی۔ کرم علی باقی سائلوں کے سامنے چائے جمانا بھی بھول گیا اور جج صاحب کی ڈانٹ کے تعاقب میں جلدی سے کمرہ چھوڑ گیا۔ چوہدری چراغ دین کے مسجد شاہ چراغ سے لحد تک کے سفر کی خبر لکھنے کے دوران مرزا موت کی مانند لب بستہ رہا مسجد شاہ چراغ سے نور پور اور نور پور سے لحد تک کی اس کی کہانی نے مرزا سے قہقہے بھی چھین لئے تھے۔ اس طویل کہانی کی اس نے بہت ہی مختصر خبر بنائی چوہدری چراغ دین کے والد کو پاکستان کی طرف ہجرت کے سفر میں شہید کر دیا گیا تھا۔ اس کے چچا چوہدری مہر دین نے اپنے بھائی کی امانت کی پرورش کی تھی اور بھائی کے نام کا کلیم داخل کر کے اس کی زمین بھی اپنے ساتھ ہی الاٹ کروائی تھی اپنے مرحوم بھائی کی دونوں امانتوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا چوہدری مہر دین فوت ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے چراغ دین کو بتایا کہ اس کی بیوہ ماں نے تو موت کے مراحل میں اس کے باپ کے نام کی زمین چوہدری مہر دین کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ ماں نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ وہ ساری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رقم اپنے ساتھ قبر میں کیوں لے گئی؟ کوئی بیوہ ماں اپنے اکلوتے یتیم بیٹے کے ساتھ ایسا دھوکہ کر سکتی ہے؟ چراغ دین کا دل اپنی مرحوم ماں کے سودے کی تصدیق نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم چچا کے بیٹوں سے اپنے شہید باپ کی زمین کے حصول کی قانونی جنگ شروع کر دی تھی اور عدالت عالیہ کے انصاف کرنے سے پہلے ہی مسجد شاہ چراغ کے کونے میں اس رات بلا اجازت مر گیا تھا۔

''یہ تو توہین عدالت کا کیس ہے'' نوجوان ادبی رپورٹر نے خبر پڑھ کر رائے دی ''عدالت عالیہ کو انصاف کا موقعہ نہ دے کر چراغ دین نے تو عدالت کی شدید توہین کی ہے''

مرزا کی آنکھوں میں لگی فروغ دہشت گردی کی عدالت کے ہونٹوں پر جنبش بیدار ہوئی اور دم توڑ گئی۔

سفید چادروں میں بندھا چراغ دین خاموش تھا ارد گرد کھڑے افسردہ لوگ بھی خاموش تھے اور دس آٹھ سال کی ایک بچی چلا رہی تھی ''میں دادا کے ساتھ جاؤں گی! میں اپنے دادا کے ساتھ جاؤں گی'' اس کے آنسوؤں سے کفن کی بے داغ چادریں داغدار ہو رہی تھیں اور سب لوگ خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ''چوہدری چراغ دین نے اپنے پیچھے بیوہ بہو اور یہ بے سہارہ پوتی چھوڑی ہیں'' مرزا نے کیپشن لکھ کر تصویر میرے سامنے رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا لیں

''وہ اپنے پیچھے پینتیس سالہ بے سہارا مقدمہ بھی تو یتیم چھوڑ گیا ہے اب اس کی پرورش کون کرے گا'' ادبی رپورٹر کیپشن پڑھ کر بڑبڑایا

''چوہدری چراغ دین کے سوگ میں نور پور کی مسجد میں قانون کی رسم قل ادا کی جا رہی ہے'' ایک تصویر کا کیپشن تھا

''یہ تو قانون کی توہین نہیں ہو جائے گی'' کرائم رپورٹر نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہیے''

''کون سے قانون کا احترام؟ اس قانون کا احترام جو انسانیت کا احترام نہیں کرتا؟ جو قانون کمزور اور بے وسیلہ انسانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر بے بسی کی موت مار دے اس کی چھن چھنانن چھن کوٹھے والی کی پائل کی چھن چھنانن چھن سے زیادہ کچھ بھی نہیں'' مرزا کی آنکھوں میں لگی فروغ دہشت گردی کی عدالت نے مختصر فیصلہ سنایا اور وہ تصویر ٹرے میں پھینک کر

رپورٹنگ روم سے نکل گیا۔ کرائم رپورٹر نے چوہدری چراغ دین کے اصل قاتل کی شناخت کیلئے دلائل پر ڈیٹ شروع کر دی کہ مہر دین، عدالت اور قانون میں سے چراغ دین کا اصل قاتل کون ہے؟

نور نواز فدائی سول سروس پر فدا ہوا تو جی این مرزا نے عدل کا پیشہ اپنا لیا تھا مگر اُلوؤں نے ابھی تک وہ گھونسلا نہیں بدلا شب رفتہ دفتر سے نکلے تو کرائم رپورٹر خلاف عادت مرجھایا ہوا تھا کامریڈ خبر چھپوانے آیا تھا کہ وہ انسانی حقوق کی پاسبان کسی انجمن کی طرف سے امریکہ جا رہا ہے۔ شاہرہ قائداعظم سنسان تھی بوڑھے پیپل سو رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ خاموش خاموش چلنے اور ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ عدل کے لحاف میں انصاف کے خراٹے لیتی عدالت عالیہ کی عمارت کی حفاظتی دیوار سے لپٹے فٹ پاتھ کے سینے میں پیوست بوڑھے پیپل کی قربت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ''کامریڈ بھی مر ہی گیا'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔

''آغا موت کی توہین نہ کریں'' کامرس رپورٹر نے منت کی

''کلمہ شہادت'' کرائم رپورٹر نے آواز اونچی کرتے ہوئے کہا اور تیز تیز چلنے لگا ہم نے بھی پاؤں کی حرکت تیز کر دی وہ اونچی آواز میں ''کلمہ شہادت'' کہتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا اور ہم اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ جی پی او چوک سے سپریم کورٹ کی عمارت کے سامنے سے ہو کر اے جی آفس کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا ''یہ مردہ تو بہت بھاری ہے'' وہ ہانپ رہا تھا

''کس کا مردہ؟ کیسا مردہ؟ آغا ہوش میں تو ہو'' کامرس رپورٹر پریشانی کی زد میں آ گیا تھا۔

''مردے کی توہین نہ کرو تم نے بھی ایک دن مرنا ہی تو ہے'' آغا نے اسے ڈانٹا

مردہ کس کا اور توہین کس کی کا جھگڑا جاری تھا کہ ہارن بجاتی گاڑی نے ہمارا راستہ روک لیا ''ہم تمہیں ادھر ڈھونڈتے آ رہے ہیں'' فدائی اور مرزا باری باری ایک ایک سے گلے ملنے لگے ''ہم آپ کے ساتھ پھٹہ چائے پینے آئے ہیں''

''یہ تو پھٹے کی اور چائے کی اور ہماری توہین ہے'' آغا کا پارہ مزید چڑھ گیا

''مرزا نے چوہدری چراغ دین کی پوتی کا یتیم کیس جیت لیا ہے ہم تمہیں خوشخبری دینے آئے ہیں'' فدائی بہت خوش تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے رحم ظالم موسموں میں
جب عدل کے چشمے سوکھ جائیں گے
تو پیاسے تیرے چشمہ سے
سیراب ہوں گے
تو اس کی دیواریں اونچی اٹھا
اور سنہری پالان والے گدھے
کی دولتیوں سے نہ ڈر
کہ لاغر اور نحیف عربی گھوڑا بھی
ایسے درجنوں گدھوں سے افضل ہے
بے رحم ظالم موسموں میں
جب عدل کے چشمے سوکھ جائیں گے
تو پیاسے تیرے چشمہ سے
سیراب ہوں گے

شب کی خاموشی میں پھٹہ ہوٹل کے سامنے فدائی آنکھیں بند کئے اپنا فیصلہ سنانے لگا۔
''پردہ مردہ اتنا بھاری کیوں تھا؟'' آغا کے حواس خوشخبری سے بھی بحال نہیں ہو رہے تھے۔
''لپٹا جو بے داغ توہین کی چادروں میں تھا'' مرزا نے فیصلہ سنایا۔

☆☆☆☆☆

زخمی بندر

چڑیوں کی چہکار کی دستک پر میں جب بھی صبح صادق میں کھڑکی کے چہرے پر سے پردہ سرکاتا ہوں اسلام الدین جھوم جھوم کر ''زخمی بندر ہانپ رہا ہے'' گانا شروع کر دیتا ہے اور چڑیوں کی چہکار اور اسلام الدین کی مستی مجھے اونچے پہاڑوں میں گھری اس وادی میں دھکیل دیتی ہے جس میں پہلی بار میں نے بندروں کا شہنشاہ دیکھا تھا ہماری کٹیا کی کھڑکی کے سامنے بکھری پڑی مردہ اور زخمی چڑیوں کے درمیان میں وہ سینہ تانے ٹہل رہا تھا اور میں نے شدت غم اور خوف میں کھڑکی بند کر لی تھی پر اب مجھے بندروں سے مقابلہ میں چڑیوں کے مرنے پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی تو تصور کی آنکھ کے سامنے مردہ اور زخمی چڑیاں بکھری پا کر مجھے خوشی اور فرحت سی محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے

میں نے بندر تو دیکھا ہوا تھا، بھورا بھورا سا بندر جس کے چہرے کی سلوٹوں پر خون پالش کی ہوتی ہے اور جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہوتی ہیں اور جو جھوم جھوم کر چلتے وقت اپنی دم اوپر کو اٹھائے رکھتا ہے اور جس کی دم کے نیچے کا حصہ بھی اس کے چہرے کے سب سے آگے کے حصہ جیسا ہی ہوتا ہے پر میں نے اس سے پہلے زخمی اور پاگل بندر کبھی نہیں دیکھے تھے۔
وہ بہت ہی خوب سیرت وادی تھی اونچے اونچے پہاڑوں میں بند اس وادی میں دن کے وقت بھی زندگی اونچی سانس نہیں کھینچتی تھی اور سورج کی روشنی وادی میں چاندنی بن کر نازل ہوتی تھی اور میرے ساتھی مجھے اس وادی کے سپرد کر کے آگے نکل گئے تھے کہ میں ان کے عزم، ہمت اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جولانیوں کا ساتھ نہیں دے سکا تھا اور اس وادی میں میرے ساتھ اسلام الدین خاں تھا پہاڑوں اور وادیوں کا مزاج شناس گائیڈ اور پورٹر نورزمان تھا اور ایک خاموشی تھی اور بہت سی چڑیاں تھیں۔ میں دن کی سرسبز روشنی میں وادی میں اور اس کے محافظ پہاڑوں پر ٹریکنگ کی مشق کر لیتا تھا اور راتوں میں دیر تک عزم و ہمت کی راہوں اور منزلوں کی دشواریاں ناپتا رہتا تھا۔

بکروالوں کی پتھر پر پتھر جما کر بنائی جس چھوٹی سی کٹیا میں ہم پناہ گزین تھے اس کی عقبی کھڑکی کے سامنے پہاڑ کے قدموں کے نیچے سے شروع ہونے والا جنگل افلاک سے ہم کلام چوٹیوں تک پھیلا ہوا تھا اور جنگل ہوتے ہوئے بھی بے ربط محسوس نہیں ہوتا تھا اونچے درختوں کے نیچے کے خلاء دست فطرت نے اس انداز میں جھاڑیوں اور پست قامت درختوں سے بھر دیئے تھے کہ ان کے پیچھے تصور ہی قدم رکھ سکتا تھا اور ان درختوں کی باسی چڑیاں جب حمد سے نئے دن کا آغاز کرتیں تو جنگل گونج اٹھتا تھا

چاندنی میں لپٹی ایک خاموش رات میں ہم اپنے ساتھیوں کے عزم کی بلندیوں پر اپنی بے بسی اور محرومیوں کی کمندیں ڈالنے میں لگے ہوئے تھے اور اسلام الدین خاں ان کی راہوں کی مشکلات کو اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں بتانے اور سمجھانے میں نیم دیوانہ سا ہو رہا تھا کہ نورزمان نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اپنے کاغذی ہونٹوں پر رکھ لی۔ خاموشی کے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنی سانس بھی دبالی تھی۔ اسلام الدین نے جلدی سے پہاڑی دوربین اپنی آنکھوں پر چڑھالی۔ وہ دونوں کھڑکی سے باہر کچھ تلاش کرنے لگے تو مجھے بھی دوربین کا سہارا لینا پڑ گیا۔ سامنے دو ننھی سی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں" شکاری بندر ہے" نورزمان نے آہستہ سے خبر دی

"یہ تو شکاری بندروں کا شہنشاہ ہے" اسلام الدین خان نے سرگوشی کی

کھڑکی کے سامنے موٹے سے درخت کے قدموں میں بندروں کا شہنشاہ دم سادھے پتھر بنا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کے سوا اس کے وجود کی کوئی گواہی نہیں تھی "جنگلی ظلم کی ایک اور کہانی" نورزمان کی آواز میں دکھ تھا

"بندر ہے تو کیا ہوا؟ جہاں جنگل ہوگا وہاں بندر بھی ہوگا" مجھے ان کی پریشانی پلے نہیں پڑ رہی تھی۔

بے وجودی کے پندرہ بیس منٹ گزار کر بندروں کا شہنشاہ درخت کے موٹے تنے

سے لپٹ گیا اپنا دم کے نیچے والا چہرہ اوپر کی طرف کئے وہ بڑی روانی سے درخت پر چڑھا جا رہا تھا۔ ایسی روانی سے جیسے اس کی آنکھیں بھی اسی چہرے میں چھپی ہوں چند ہی لمحوں میں وہ درخت کی الجھی ہوئی شاخوں میں کہیں نابود ہو گیا۔ جنگل خاموش تھا وادی خاموش تھی چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں بے فکر سو رہی تھیں اور بندروں کا شہنشاہ ایک دوسری میں الجھی شاخوں کے الجھاؤ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ میرے دونوں ساتھی پریشان سے ہو رہے تھے اور میرے لئے وہ سب کچھ ناقابل فہم ہوتا جا رہا تھا اور جنگل کی رات چاندنی اوڑھے سو رہی تھی

پھر سارا جنگل جاگ اٹھا چڑیاں اپنی معصومیت اور ناتوانی کی پوری قوت سے چیخنے چلانے اور مردہ اور زخمی حالت میں ہماری کٹیا کی کھڑکی کے سامنے گرنے لگیں۔ بندروں کے شہنشاہ نے چڑیوں کی معصومیت کے گھونسلوں پر حملہ کر دیا تھا۔ چڑیاں چیخ چیخ کر جنگل کے خوابیدہ ضمیر کو اس کے ظلم سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور مر مر کر اور زخمی ہو ہو کر کھڑکی کے سامنے گر رہی تھیں۔ اسلام الدین خان نے اپنی آنکھوں پر چڑھائی پہاڑی فاصلوں کو ناپنے والی دوربین ایک طرف رکھ دی اور اپنے کاغذی ہونٹوں پر سے انگلیاں اٹھالیں۔ وہ دونوں چڑیوں کے غم کے بحر منجمد میں غوطے کھانے لگے۔ فضا جو ابھی خاموش تھی چڑیوں کی چیخ و پکار سے معمور ہو گئی تھی مگر بندر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور مجھے خوف سا آنے لگا تھا۔ میں نے کبھی چڑیوں کو اس معصومیت کی موت مرتے اور زخمی ہوتے نہیں دیکھا ہوا تھا اور بندر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ جو بندر ہوتا ہے بھورا بھورا سا اور اس کے دو چہرے ہوتے ہیں وہ کھاتا کیا ہے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ چڑیوں کے گھونسلوں پر بھی حملے کر دیا کرتا ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اسلام الدین خان میری بندر ناشناسی پر مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کٹیا کی ٹین کی چھت پر زوردار دھما کہ ہوا پھر ایک اور دھما کہ اور پھر ایک اور دھما کہ۔ درخت کے اوپر سے بندر ہماری کٹیا پر چھلانگیں لگانے لگے وہ کئی ایک تھے پھر وہ کٹیا کی چھت سے اپنے شہنشاہ کی قیادت میں ہماری کھڑکی کے سامنے مردہ اور زخمی پڑی چڑیوں کے درمیان کود گئے۔ اوپر فضا میں چڑیاں چیخ رہی تھیں اور نیچے زمین پر بندروں کا شہنشاہ سینہ تانے دم لہراتا ہوا ٹہلتا پھر رہا تھا مردہ اور زخمی چڑیوں کے درمیان

دوپہر ڈھلے ہم ٹریکنگ کی مشق کرنے گئے تو ندی کے صاف شفاف پانی پر جھکی ایک چٹان پر بہت سے بندر سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ایک دائرے میں بیٹھے بندروں میں سے کسی ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی بھی دم تنی ہوئی نہیں تھی سب کی دُمیں ان کے پیچھے چٹان میں پیوست پڑی تھیں۔ بندروں کی گردنیں آگے کو جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ کسی ایک کا بھی صاف بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسلام الدین کی ہدایت پر ہم ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے سانس روک کر بیٹھ گئے۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا غول آیا اور بندروں کے اوپر فضا میں چکر لگانے لگا چڑیاں چیخ رہی تھیں چلا رہی تھیں شور سیاپا کر رہی تھیں اور غوطے لگا لگا کر بندروں پر جھپٹ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی بڑے بڑے بندروں پر جھپٹ پلٹ پر بندر اچھلنے کودنے لگے وہ سب اچھل اچھل کر معصوم چڑیوں کو پکڑنے کی کوششوں میں لگ گئے اور چڑیاں ان کے گھومنے سے پہلے ہی فضا میں بلند ہو جاتیں تھیں پھر تو جیسے چڑیوں نے بندروں کے شہنشاہ کو شرمسار کرنے کی قسم اٹھالی ہو وہ باری باری جھپٹ جھپٹ کر اس کی اوپر کو اٹھی دُم پر حملے کرنے لگیں اور اس کی شہنشاہیت کی دُم اپنے پاؤں سے چھونے لگیں اور بندروں کا شرمسار شہنشاہ اچھلنے کودنے غرانے اور چلانے لگا پھر اس نے اپنی اوپر کو اٹھی لمبی دُم ڈال لی اس کی اور اس کے ساتھی بندروں کی دُمیں چٹان کو چھونے لگی تھیں اور چڑیاں جھپٹ جھپٹ کر اور پلٹ پلٹ کر ان کی دُموں پر وار کر رہی تھیں ''بندروں کا شہنشاہ تو زخمی ہے'' اسلام الدین خان نے سرگوشی کی۔

''شہنشاہ زخمی ہے؟''

''جی شہنشاہ زخمی ہے''

''پر وہ تو اچھل رہا ہے غرا رہا ہے اور کود رہا ہے''

''آپ نہیں سمجھ سکتے پاگل بندر کو بس جلدی سے نکل چلیں یہاں سے زخمی اور پاگل بندر بہت خطرناک ہوتے ہیں چڑیاں تو ان کے قابو نہیں آ رہیں وہ غصہ میں ہم پر بھی حملہ کر سکتے ہیں''

ہم بندروں کو اور ان کے شہنشاہ کو اچھلتے کودتے، چیختے چلاتے اور چڑیوں کو بلندیوں سے ان پر جھپٹتے چھوڑ کر واپس آ گئے

آنے والی رات ہم اپنی کٹیا میں چھپے رہے بندروں کی ٹولیاں کٹیا کی ٹین کی چھت پر کودتی رہیں۔ کھڑکی اور دروازے پر پتھر مارتی رہیں۔ مجھے ان کا غصہ بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا چھوٹی چھوٹی چڑیوں سے بڑے بڑے بندروں اور ان کے شہنشاہ کے لڑائی جھگڑے میں ہم تو کہیں بھی نہیں آتے تھے اور وہ ہم پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ بندروں اور ان کے شہنشاہ کی بلا اشتعال چیخ و پکار کے درمیان میں میرے موبائل نے ایس ایم ایس پیغام دیا کہ کہیں بہت

آگے کسی اور وادی میں بندروں نے ہمارے ساتھیوں پر بھی حملہ کر دیا ہے۔ اسلام الدین پیغام سن کر بے قابو ہو گیا اور خوشیوں کے دورہ میں جھوم جھوم کر گانے لگا

چڑیوں کے بچوں کا قاتل
زخمی بندر ہانپ رہا ہے
آنے والے وقت کے ڈر سے
ظالم بندر کانپ رہا ہے

جب بھی کبھی اسلام الدین خان میری کھڑکی کے سامنے جھوم جھوم کر والہانہ مستی میں ''ظالم بندر کانپ رہا ہے'' گانا شروع کرتا ہے تو میرے تصور کے قدم اس وادی کے لئے بیتاب ہو ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی مجھے چڑیوں کی موت سے فرحت سی محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلی فلو

رپورٹنگ روم کی لمبی سی برہنہ میز کے گرد ہم شہر کی نبضوں پر انگلیاں جمائے بیٹھے تھے۔اس روز شہر میں خون کچھ زیادہ ہی بہہ گیا تھا اور ہم اپنے تعلقات اور میل ملاپ کے بوجھل وجود سے چند بوتل خون بھی نہیں نچوڑ سکے تھے اور خون کی شدید ضرورت کے لمحہ میں محسوس ہونے لگا تھا جیسے شہر کا اور ہمارے میل میلاپ اور تعلقات کا سارا ہی خون سڑکوں پر بہہ گیا ہو ہم شہر کی نبضیں اور خون تلاش کر رہے تھے کہ کرم علی بڑبڑایا ''بلی! بلی!''

''بلی کا خون چل جائے گا؟'' سوچ کی بے دماغی میں میری زبان سے ٹپک گیا

''گروپ کون سا ہے بلی کے خون کا؟'' کرائم رپورٹر شاید مجھ سے بھی زیادہ خون کی گہرائی میں اترا ہوا تھا۔

خون میں غوطہ خوری سے نکلنے کی کوشش میں نظر اٹھائی تو سامنے رپورٹنگ روم کے دروازے میں نیوز ایڈیٹر کھڑا مسکرا رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں غیر فطری چمک تھی۔کسی شکاری بلی کی آنکھوں کی اس لمحہ خاص کی فطری چمک جیسی جب وہ کسی گھپ اندھیرے کمرے میں کسی چوہے کو دیکھ کر اس کی پیشگی موت پر مسکراتی ہے۔شاہ جی جب بھی اپنی نیوز ایڈیٹری کی کمان میں مسکراہٹ کے زہریلے تیر چڑھائے رپورٹنگ روم تک آتے تھے تو ہم جان جاتے تھے کہ انہوں نے ہماری کسی غلطی کا کافی وزنی چوہا پکڑ لیا ہے اور مالک ایڈیٹر کو اس سے اچھی طرح آگاہ کرنے کے بعد ادارے کے مفاد میں ہم پر مسکرانے آئے ہیں۔''آپ نے یہ تصویریں

دیکھی تھیں؟'' انہوں نے خون میں نہائی دھوئی تصویریں میرے سامنے پھیلا دیں

''جی شاہ جی دیکھ کر ہی بھیجی تھیں دیکھی نہ ہوتیں تو آپ کی زیارت میسر آ سکتی تھی؟'' ان کی مسکراہٹ کی چمک سے میرے خون کی حرکت میرے قابو سے باہر ہو گئی

''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ہم نے اخبار صبح بیچنا ہے''

''جی شاہ جی مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ جب آپ نہیں ہوتے تھے اس وقت بھی یہ اخبار بکا ہی کرتا تھا''

''یہ تصویریں تو نہیں بکتیں مردے تو ایسے مسکرا رہے ہیں جیسے فوٹو گرافر سے لین دین کر رہے ہوں۔''

میں نے تصویریں اکٹھی کر کے سامنے ٹرے میں رکھ دیں۔''آپ ادارے کی طرف سے اشتہار چھاپ دیں کہ اگر کوئی زخمی یا مرنے والا آپ کے اخبار میں تصویر چھپوانا چاہتا ہے تو وہ ذرا قابل فروخت طریقہ سے مرا کرے''

شاہ صاحب نے تصویریں اٹھا لیں اور بڑبڑاتے ہوئے نیوز روم کی راہ لگ گئے اور ایک موٹی تازی بلی الماری کے پیچھے سے نکل کر ہمیں میاؤں کئے بغیر ان کے پیچھے دوڑ گئی

اس روز صبح سے شہر کی گلیوں اور بازاروں میں جنگ ہوتی رہی تھی۔عام نہتے شہری پولیس والوں سے دست بدست جنگ میں مرتے اور زخمی ہوتے رہے تھے۔شہر کے ہسپتالوں کے مردہ خانوں میں نامعلوم مرنے والے اور وارڈوں میں لاوارث زخمی پڑے تھے۔شہر جل رہا تھا اور ہمارا ساتھی فوٹو گرافر ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا اور اپنے تعلقات اور میل میلاپ کے بوجھل وجود سے ہم اس کے لئے چند بوتل بھی خون نہیں نچوڑ سکے تھے اور اس کی بنائی تصویریں نا قابل فروخت ہو گئی تھیں اور ہم سب اور بھی زیادہ تھک گئے تھے۔رپورٹنگ روم کے ٹیلیفون مسلسل چلا رہے تھے۔کوئی مرنے والوں کے نام جاننا چاہتا تھا کسی کا بیٹا نہیں مل رہا تھا کسی کا بھائی گم تھا کوئی مذمتی بیان چھپوانا چاہتا تھا کسی کے پڑوس میں آگ لگی ہوئی تھی کوئی فائر بریگیڈ والوں کی لاپرواہی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا ہم بہت ہی مصروف تھے اور بہت ہی تھکے ہوئے تھے اور درمیان میں ''تو پھر خون کا کیا کریں؟'' آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ لیتے تھے

کوئی خبر چھپے گی یا نہیں چھپے گی کوئی تصویر کہاں لگے گی یا بالکل نہیں لگے گی اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیصلہ نیوز ایڈیٹر کو کرنا ہوتا ہے۔ رپورٹروں کی لائی اور بنائی خبروں کو تولنا، ٹٹولنا اور ادارے کی پالیسی اور مفاد کے ترازو میں وزن کر کے بڑھا چڑھا کر یا گھٹا کر شائع کرنا نیوز ایڈیٹر کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی حدود رپورٹنگ روم کے دروازے تک محدود ہوتی ہیں اور فربہ حسن میں لپٹی بلی رپورٹنگ روم کی الماری کے نیچے سے نکل کر بھاگ گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں نہ کوئی چمک تھی نہ روشنی۔ باہر سڑک پر سے فائر بریگیڈ کے گھڑیال چیخ چیخ کر کرائم رپورٹر کو شہر میں جگہ جگہ روشن اس کے فرائض سے آگاہ کر رہے تھے اور وہ شہر کی بجائے فوٹو گرافر کے بارے میں فکر میں مبتلا دکھائی دینے لگا تھا ''اس کی والدہ بیمار ہے، اسے کیا بتائیں؟ کیا کریں کچھ سمجھ نہیں پڑ رہا''

''پیغام دے دیں کہ ہنگامی کام کے سبب آج رات وہ دفتر میں ہی رہے گا'' میں نے سر جھکا کر کہہ دیا

''میرے اور کرم علی کے ساتھ'' دفتر کی سیڑھیوں پر ادبی رپورٹر نے گرہ لگائی

دفتر میں تھکی ماندی ڈیوٹی والوں اور زخمی اور بیمار ہو جانے والوں اور ہنگامی حالت میں پھنس جانے والوں کے لئے شب بتانے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور ہنگاموں اور آگ اور پولیس کے خوف سے ٹرانسپورٹ محفوظ پناہ گاہوں میں دبک گئی تھی اور ان دونوں کو کافی دور جانا ہوتا تھا

''اور خون؟ اس کا گروپ تو ہسپتال والوں کے بنک میں بھی نہیں مل رہا'' کرائم رپورٹر خون! خون! کر رہا تھا

''چیف سلوتری آپ سے بات کرنا چاہتا ہے'' ٹیلیفون آپریٹر نے ''اور خون'' کا خون کر دیا۔ وزیر اعلیٰ نے ہنگامی پریس کانفرنس طلب فرمائی تھی اور ان کے سب سے اعلیٰ تشہیری افسر اپنے فرائض کی لائن پر خود حاضر تھے اور ہمارے لئے وزیر اعلیٰ کی ہنگامی پریس کانفرنس اپنے ساتھی کی بے ہوشی اور خون کی ہنگامی ضرورت سے زیادہ اہم تھی

وزیر اعلیٰ نے اپنی اپنی شر پسندی کے خون سے شہر کی سڑکوں کا تقدس مجروح کرنے والوں کی مردہ خانوں میں پڑے لاوارث مرنے والوں کی اپنی ہی شر پسندی کی زد میں آ گئے زخمیوں کی، سرکاری اور غیر سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والوں کی اور ملک کے دشمن خفیہ خفیہ ہاتھوں کی اپنے عزم اور اپنی حکومت کے استحکام کے مکے لہرا لہرا کر مذمت کی۔ ملک دشمنوں کے جملہ عزائم ناکام بنا دینے کے وزیر اعلیٰ کے عزم کی تپش سے ٹھنڈے یخ کمرے

میں بھی ان کے چہرے پر جمائی میک اپ کی بنیادیں لرز رہی تھیں۔ انہوں نے سر پسندوں کی شر پسندی کے ہاتھوں زخمی ہوئے اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کے ساتھ اپنی ساری سرکاری ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کے علاج کے سارے اخراجات حکومت کی طرف سے ادا کرنے کا اعلان کر دیا۔ شہر میں ہلکے پھلکے سے کرفیو کا نفاذ کر دیا گیا تھا اور رات کی شفٹ والوں فوٹو گرافروں اور رپورٹروں کے پاس کرفیو پاس نہیں تھے اور کسی بھی اخبار کے دفتر میں اس کے ایسے کارکنوں کے بقیہ رات گزارنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ وزیر اعلیٰ نے اپنے اعلیٰ تشہیری افسر کو ایسے سب اخبار نویسوں کو بلا کسی دکھ تکلیف کے ان کے گھروں تک پہنچانے کیلئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔

وزیر اعلیٰ کے عزم اور اعلان کی خبر لکھ کر میں اس کی نوک پلک کی میک اپ کے مراحل میں کم صم تھا کہ کرم علی نے ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ فربہ حسن میں لپٹی آنکھوں میں شاعرانہ مستی جمائے ایک بلی ہڈیوں کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔ ''وزیر اعلیٰ صاحب کی اس بلی کی تصویر چھپ جائے گی؟''

''یہ تو شاہ صاحب ہی بتا سکتے ہیں''

میری آنکھوں میں ناپسندیدگی کے ڈورے دیکھ کر وہ وزیر اعلیٰ ہاؤس کی بیٹ والے رپورٹر سے سرگوشیاں کرنے لگا ''وزیر اعلیٰ کی بلی اتنی ساری ہڈیاں کھائے گی کیسے؟''

''اس کے بال بچے بھی تو ہیں'' رپورٹر نے جواب دیا

''وہیں رہتے ہیں وہ سب وزیر اعلیٰ ہاؤس میں؟''

''وزیر اعلیٰ نے اپنی بلیوں اور کتوں کو گھر جو دیئے ہوئے ہیں''

وزیر اعلیٰ نے اپنی بلیوں اور کتوں کو تو کرفیو پاس بنوا دیئے ہوں گے ہم سے تو وہی اچھے ہیں''

مجھے کرم علی کی اس خالص سادگی پر مسکرا دینا چاہیے تھا مگر وزیر اعلیٰ کے عزم اور اعلان کی خبر کی نوک پلک درست کر کے اسے شتابی سے نیوز روم بھیجنا مسکرانے سے زیادہ اہم تھا۔ آخری کاپی کا وقت قریب تر آ رہا تھا اور مجھے ابھی زخمی شہر کا جائزہ بھی لینا تھا۔ باہر سڑکوں پر کرفیو کا راج جم چکا تھا اور ہم میں سے کسی کے پاس بھی کرفیو پاس نہیں تھا۔ ہسپتالوں میں مزید کتنے شر پسند آئے ہیں؟ پہلے والوں میں سے کتنے آنجہانی اور فانی ہو گئے ہیں؟ نامعلوم مرنے والوں میں سے کتنوں کے وارث معلوم ہو چکے ہیں؟ وقت دوڑا جا رہا تھا اور ہمیں اپنا اخبار صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیچنا تھا۔ مجھے کرم علی کی خالص سادگی پر غصہ آنا شروع ہو گیا ''بند کرو یہ کتے بلی وزیر اعلیٰ کی بکواس یہ سلپ لو اور شاہ جی کو دے آؤ جلدی سے''۔

''سبحان اللہ! سبحان اللہ!'' ادبی رپورٹر دایاں ہاتھ اپنی پیسانی تک لے جا کر چلا رہا تھا کہ ٹیلیفون نے شور مچا دیا۔ ''چیف سلوتری آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں'' ٹیلیفون کے شور اور آپریٹر کی مداخلت نے ''سبحان اللہ!'' اور مکرر! مکرر! کو بالکل ہی خلط ملط کر دیا مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ اس کے قصیدہ سے آزاد غزل تک کی صدیوں پر محیط خاموشی توڑنے کا سبب کیا ہو گیا تھا۔ ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنگ فکر مند تھے کہ ہم وزیر اعلیٰ کی بلی کی ہڈیاں چبانے والی تصویر شائع نہ کر دیں

ہوا تیز ہو تو بادلوں کو کہیں دور جانے کی جلدی ہوتی ہے وہ زمین اور اہل زمین سے بلندیوں پر شکلیں بدل بدل کر بھاگے چلے جاتے ہیں۔ اس رات ہوا بند تھی بادل بلندیوں سے بہت نیچے اتر آئے تھے اور وزیر اعلیٰ ہاؤس کے بوڑھے درختوں سے ہم آغوش ہو رہے تھے پھر شدت جذبات میں ان کی آنکھوں سے چھم! چھم! پانی برسنے لگا۔ بادلوں کے آنسو وزیر اعلیٰ ہاؤس کے بوڑھے درختوں کے پتوں شاخوں اور تنوں پر سے بہتے ہوئے ان کے قدم چومیں گے اور پھر لانوں کی گھاس اور پھولوں کی کیاریوں میں سے ہوتے ہوئے لہروں کی صورت میں وزیر اعلیٰ ہاؤس کی نالیوں میں گرتے ہی بادلوں کے وہ پاک صاف آنسو تو ناپاک ہو جائیں گے میں ان کی ناپاکی کے دکھ میں پریشان سا ہو گیا اور ہوا کی تیزی کی دعائیں کرتا جلدی سے دفتر کی چھت سے اتر آیا شہر کی سڑکوں پر مسجدوں کے صحنوں میں اور عدالت عالیہ کے احاطہ میں بہت سا خون جما ہوا تھا اور مجھے اس خون کی پاکیزگی کی فکر لاحق ہونے لگی تھی

شروع ہو چکے دن میں اور آنے والی رات کے لئے اپنی کارکردگی کی منصوبہ بندی کے لئے ہم رپورٹنگ روم کی لمبی سی برہنہ میز کے گرد سر جوڑے بیٹھے تھے اس صبح شہر میں بکنے والے جملہ اخبار میز پر پھیلائے ہم شب رفتہ اور یوم گزشتہ کی اپنی خامیوں اور ناکامیوں پر کافی شرمسار تھے۔ ہمارے اخبار کے پہلے صفحہ پر سب سے بڑی سرخی جسے اخباری زبان میں شہ سرخی کہا جاتا ہے مرغیوں کو برڈ فلو سے بچانے کے لئے حکومت کے اقدامات سے متعلق تھی۔ اس کے ساتھ ہی وزیر صحت کا بیان تھا کہ پورے ملک میں مرغیاں بالکل خیریت سے ہیں۔ سرکاری ڈاکٹروں نے قوم کو بے فکر ہو کر مرغ مرغیاں کھانے کا مشورہ دیا تھا اور حلفیہ اعلان چھپوایا تھا کہ

کسی بھی ہسپتال میں برڈ فلو کا کوئی کیس نہیں آیا۔ ایک بڑی سی تصویر میں صوبائی گورنر کو مرغی کی بڑی سی ٹانگ میں دانت گاڑھے دکھایا گیا تھا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ وفاقی کابینہ کے اجلاس کے دوران سب وزراء نے پیٹ بھر بھر کر مرغی کا گوشت کھایا تھا۔ شر پسندوں کو نشان عبرت بنا دینے کے وزیر اعلیٰ کے عزم اور اعلان کی خبر بھی پہلے صفحہ پر ان کی رنگین تصویر کے ساتھ فلیش کی گئی تھی۔ زرعی ماہرین نے بتایا تھا کہ شب رفتہ کی بارش سے ملک میں گندم کی پیداوار بڑھ جائے گی۔ یہ پیش گوئی بھی پہلے صفحہ کی زینت تھی۔ صفحہ اول پر باقی جگہ صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے ترقیاتی کارناموں کے بارے میں، رنگین اشتہاروں نے لے لی تھی اور رپورٹنگ روم والوں کی یوم گزشتہ اور شب رفتہ کی ساری کارکردگی صفحہ آخر سے شروع ہو کر اندر خانہ چلے گئی تھی۔ شہر کے سارے اخبارات کو اس صبح کی بکری کے ترازو میں تولنے کے دوران میں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی نااہلی کے بوجھ سے جھکی گردن اٹھائی تو سامنے کی دیوار پر وزیر اعلیٰ ہاؤس کی وہی بلی آنکھوں میں شاعرانہ مستی سمائے ہڈیوں کے ڈھیر پر بیٹھی ہماری ٹیم کی روز و شب رفتہ کی کارکردگی پر مسکرا رہی تھی اور اس کی تصویر کے نیچے کرم علی افسردہ بیٹھا تھا۔ ڈاکٹروں نے ہمارے ساتھی فوٹو گرافر کی زندگی اور موت کے تنازعہ میں اپنی مکمل غیر جانبداری کا پیغام بھیج دیا تھا

ادبی رپورٹر نے اپنے سامنے پڑی اس صبح کے اخباروں کی فائل اٹھا کر دور پھینک دی اور میز پر ایک چٹ رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کرائم رپورٹر چٹ اٹھا کر بڑبڑانے لگا۔

اس شہر کے اخباروں کو
چیف سلوتری کے یاروں کو
ہو گیا ہے بلی فلو! بلی فلو!

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاریخ کے پھٹ

میں نے ابھی ابھی نیویارک کے چار ریٹرن ٹکٹ مہندر سنگھ کو واپس بھجوائے ہیں تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹیلیفون کیا تھا ''بھائیا جی آپ کو ٹکٹ مل گئے ہیں؟'' وہ چاہتا ہے کہ اس کی ''بہن'' ''بھانجے'' اور میں کرسمس کی چھٹیاں امریکہ میں اس کے ساتھ گزاریں۔ میں نے ٹکٹ تو اسے واپس بھجوا دیئے ہیں پر ابھی تک گھر نہیں جا سکا۔ مہندر سنگھ کی ''بہن''، میری بیوی نے کئی بار ٹیلیفون کیا ہے۔ میں ہر بار یہی کہتا ہوں ''بس آ رہا ہوں، بس آ رہا ہوں'' میں کئی بار اپنی آنکھیں ٹھنڈے پانی سے دھو چکا ہوں پر آئینہ کہتا ہے ابھی گھر نہ جانا۔ آئینہ بھی پریشان ہے، میں بھی پریشان ہوں اور گھر میں میری بیوی بھی پریشان ہے پریشان تو مہندر سنگھ بھی ہوگا مگر میں بے بس ہوں۔

ایک روز میں دفتر سے آ کر کپڑے بدل رہا تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ میری بیوی کچن میں تھی جتنی دیر میں کپڑے بدلتا رہا گھنٹی چیختی ہی رہی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک لمبے تڑنگے سردار جی گھنٹی پر انگلی رکھے کھڑے تھے۔ میں نے سوچا کسی سکھ کے گھر کا پتہ پوچھنا چاہتے ہیں پر میرے اڑوس پڑوس میں تو کوئی سکھ نہیں رہتا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سردار جی نے ہنستے ہوئے کہا ''دروازہ روک کر کیوں کھڑے ہو گئے ہو میں تمہارے گھر رات گزارنے تو نہیں آیا، فکر والی کوئی بات نہیں بیٹھک کا دروازہ کھولو میں ماسٹر چراغ دین کا بھائی ہوں اپنی دھی رانی کے سر پر پیار دے کر فوراً واپس چلا جاؤں گا، کوئی فکر نہ کرو''

اپنے سسر کا نام سن کر میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔

سردار جی نے دو ڈبے اٹھائے ہوئے تھے ڈبے میز پر رکھ کر وہ بیٹھنے ہی والے تھے کہ سامنے ہماری شادی کی تصویر پر نظر پڑ گئی۔ ''یہ تو تم ہو گے یہ ہماری دھی رانی ہو گی لیکن میرا ویر کہاں ہے؟ تصویر میں تو تمہارا باپ بھی دکھائی نہیں دے رہا'' سردار جی نے اپنی سفید سفید آنکھیں تصویر کے پاس کر کے پوچھا۔

''وہ دونوں ہماری شادی سے پہلے ہی۔۔۔''

''اچھا! اچھا! میں سمجھ گیا وہ دونوں مر گئے ہوں گے'' وہ میری بات پوری سنے بغیر ہی بول پڑے اور افسردہ ہو گئے۔ ''ہم سب نے مر جانا ہے یہ دنیا تو مسافر خانہ ہے کوئی آج گیا تے کوئی کل گیا''۔ وہ مڑے اور کانپتے کانپتے صوفے پر گر ہی گئے۔ میں آگے بڑھا تو کہا ''نہیں پتر میں ٹھیک ہوں آپ یہاں بیٹھ جائیں میرے پاس''۔

سردار جی اپنی پگڑی درست کرنے اور نارمل دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگے جیسے پگڑی سے پیار کر رہے ہوں۔ ''اس ڈبے میں مٹھائی ہے ہمارے اپنے گاؤں کے حلوائی کی بنائی میں نے سوچا ہمارے ولایت میں رہنے والے دو ہتھرے اپنے باپ دادے کے گاؤں کی مٹھائی کا ذائقہ ہی نہ بھول جائیں اس دوسرے ڈبے میں کوئی کپڑے شپڑے ہوں گے بلونت کور کی ماں نے اس میں اور کیا کچھ بند کیا ہوا ہے مجھے معلوم نہیں یہ ماں بیٹیوں کا آپس کا معاملہ ہے مجھے تو اس نے دو گٹھڑیاں دے کر اتنا ہی بتایا تھا کہ ایک بلونت کور کے لئے ہے اور ایک دو جی دھی رانی کے لئے ہے۔ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہے تو وہ بھی ہمارے راکھ کی ہی بیٹی'' انہوں نے دونوں ڈبے باری باری اٹھا کر ایک بار پھر میز پر رکھ دیئے۔

میں چائے کہنے کو اٹھا تو وہ بھی کھڑے ہو گئے ''اچھا ٹھیک ہے میں چلتا ہوں یہاں ولایت آ کر بندے وقت کے بڑے پابند ہو جاتے ہیں۔ پر ہاں یاد آیا اپنی دھی رانی سے تو میں ابھی ملا ہی نہیں، ذرا انہیں بلوا دیں میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا اس کے سر پر پیار دے کر چلا جاؤں گا آپ کوئی فکر نہ کریں''۔

''نہیں سردار جی ایسی تو کوئی بات نہیں آپ جتنی دیر تک دل چاہے یہاں بیٹھیں میں تو ذرا اندر جا رہا تھا''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ اندر جا رہے ہیں؟ اندر تو ہم بیٹھے ہوئے نہیں؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا مطلب تھا کہ میں ذرا رسوئی تک جا رہا تھا''

''اچھا! اچھا! ٹھیک ہے ہوآ ؤ تم رسوئی سے تم نے بھی چولہے پر ہانڈی رکھی ہوئی ہوگی، جاؤ ہو آ ؤ رسوئی تک کہیں ہانڈی جل ہی نہ جائے یہاں ولایت میں لڑکوں کو ہانڈی روٹی بھی خود ہی کرنا پڑتی ہے، ٹھیک ہے ہوآ ؤ ہر ملک کا اپنا اپنا رواج ہوتا ہے، میں یہیں بیٹھا ہوں ہانڈی لگ گئی تو گھر میں کوئی پواڑا ہی نہ پے جائے لہنا سنگھ نے بھی یہیں آ کر ہانڈی روٹی پکانا سیکھا ہے پر اس کے ہاتھ میں بلونت کور کی ماں کی پکائی ہانڈی جیسا مزہ نہیں ہوتا ''

''نہیں سردار جی ہانڈی وانڈی کا کوئی چکر نہیں میں تو چائے کہنے جا رہا تھا ''

''نہیں او بھائیا مجھے تو معاف ہی رکھ اس چائے سے ہم تو لسی پینے والے بندے ہیں پر یہاں کی گوری بھینسوں کے دودھ سے تو شاید لسی بن ہی نہیں سکتی میں تو جب سے آیا ہوں دارو پانی پر ہی گزارہ کر رہا ہوں، تم چائے رہنے دو اور دھی رانی کو ذرا بلا دو میں اس کی چاچی کا پیار اس کے سر پر دے کر ایک بوجھ تو اتار دوں''

میری بیوی آئی تو سردار جی دونوں بازو بلند کر کے کھڑے ہو گئے اور اس کے سر پر بڑا گوڑھا پیار دیتے ہوئے کہا ''یہ پیار تو تمہاری چاچی کا ہے'' انہوں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ بلند کئے ''اور یہ تمہارے چاچا رنجن سنگھ کا پیار ہے تم تو مجھے نہیں پہچانتی ہوگی پر میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اپنے خون اور مٹی کو کون بھول سکتا ہے؟ تمہارا باپ چراغ دین میرا بھائی تھا اگر وہ زندہ ہوتا تو تمہیں بتاتا کہ ہمارا آپس کا کتنا قریبی رشتہ ہے تمہاری بہن بلونت کور بھی یہیں رہتی ہے اس کا خاوند لہنا سنگھ بھی یہیں ہوتا ہے میں بھی ان دنوں ان کے پاس ہی ہوں اور تمہاری چاچی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میری دو جی دھی سے بھی مل کر آنا یہ مٹھائی اور کپڑے تیری چاچی نے ہی تیرے لئے بھیجے ہیں''

میری بیوی اندر جانے کے لئے مڑی تو سردار جی نے روک لیا ''پتری جی اب تو آپ کو سب کچھ معلوم ہو ہی گیا ہے تم دونوں بہنیں ایک دوسری سے ملتی رہا کرو بندا بندے کا دارو ہوتا ہے پھر یہاں تمہیں اپنے اپنے خاوند کی چغلیاں کرنے کو بھی تو کوئی سہیلی نہیں ملتی ہوگی یہاں کی گوریوں کے ساتھ انگریزی میں چغلیاں کرنے کا وہ سواد بھی تو نہیں آتا ہوگا جو اپنی پوتر بولی میں چغلیاں کرنے سے آتا ہے''

میرے دونوں بیٹے پاس کھڑے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی سکھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ سردار جی کی باتیں سمجھنے اور انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ سردار جی نے پہلے چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر پیار کیا اسے چوم چاٹ کر بڑے کو اٹھا لیا پیار کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ دونوں بھائی کبھی سردار جی کی پگڑی کو دیکھتے تھے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگ جاتے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ سردار جی نے اتنی بڑی پگڑی کے نیچے کیا چھپا رکھا ہے۔ سردار جی بھی شاید ان کی پریشانی سمجھ گئے تھے ''بیٹا جی یہ پگ ہے'' انہوں نے اپنی پگڑی پر ہاتھ رکھ کر کہا ''اس پگڑی کے نیچے میرے کیس ہیں تمہارے بزرگوں کے سروں پر بھی ایسے ہی کیس ہوا کرتے تھے پر انہوں نے وہ کیس منڈوا دیئے تھے اور ہم ابھی تک اپنے یہ کیس پٹواتے پھر رہے ہیں'' وہ پہلی بار تھوڑے سے مسکرائے اور پھر اپنی داڑھی کو ہاتھ لگا کر کہا ''اور یہ میری داڑھی ہے تمہارے دادے اور نانے کی بھی داڑھی تو ہوتی تھی پر وہ تم نے نہیں دیکھی ہوگی تمہاری مسجد کے مولوی کی بھی داڑھی ہوگی وہ تو تم نے دیکھی ہی ہوگی''

پھر سردار جی نے اپنا بازو اوپر اٹھا کر چھوٹی سی کرپان نکال کر کہا ''لیکن یہ تمہارے مولوی کے پاس نہیں ہوگی، تمہارے بزرگوں کے پاس یہ بھی ہوتی تھی لیکن پھر وہ مولوی صاحب بن گئے تھے اور انہوں نے اپنا اپنا کڑا تے کرپان اتار دیئے تھے''

''اور سردار جی کچھا؟'' میرے منہ سے بے دھیانی میں نکل گیا

''میں نے کچھا پہنا ہوا تو ہے مگر ان بچوں کو یہاں دکھاؤں کیسے؟'' وہ ایک بار پھر مسکرائے۔

اس شام میری بیوی تو ہوا میں اڑتی پھر رہی تھی میرے بیٹے بھی سردار جی سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ مٹھائی کے ڈبے میں پنجیری اور چاول کی پنیاں بھی تھیں ہم سب نے وہ بھی خوب کھائیں۔ کپڑوں کے ڈبے میں ایک ساڑھی اور لڑکوں کے لئے سوٹ تھے اور ان کے ساتھ کچھے بھی تھے۔

ایک دن میں دفتر سے آیا تو میری بیوی نے پوچھا ''آپ کو معلوم ہے چاچا رنجن سنگھ بہت بیمار ہیں؟''

''کل دوپہر کو تو وہ اچھے بھلے تھے میں نے انہیں پارک میں دیکھا تھا''

''دن کو تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں پر رات کو انہیں کوئی دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ سوتے میں چیخیں مارنا شروع کر دیتے ہیں اور چیختے ہوئے اٹھ جاتے ہیں ساری رات نہ خود سوتے ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ گھر میں کسی اور کو سونے دیتے ہیں بلونت کور بہت پریشان ہے وہ تو رات کو سو بھی نہیں سکتے۔"

"انہوں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا انہیں"

"بلونت کہتی ہے کہ چاچا جی کو یہ بہت پرانا مرض ہے وہ یہاں علاج کرانے ہی آئے ہیں پر کسی ڈاکٹر کو بھی ان کا مرض سمجھ نہیں آ رہا"

"یہاں تو بہت سیانے سیانے ڈاکٹر ہیں تم فکر نہ کرو میں خود کل اپنے ڈاکٹر سے بات کروں گا" میں نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ اپنے چاچے کے غم میں کچھ زیادہ ہی مبتلا ہو گئی ہے

اگلے روز میں نے اپنے ڈاکٹر سے بات کی، اس نے دو تین ماہرین کے ٹیلیفون نمبر دیئے میں نے ان ڈاکٹروں کے نمبر لہنا سنگھ کو دیئے تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس نے اس کا برا مانا ہو.

ایک روز میں ناشتے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ میری بیوی زار و قطار رونے لگی "آپ کو معلوم ہے آج کیا ہوا ہے؟"

نوالہ میرے حلق میں پھنس گیا "کیا ہوا ہے؟ پاکستان سے کوئی بری خبر تو نہیں آئی؟"

"پاکستان سے نہیں بلونت کا ٹیلیفون آیا تھا وہ بیچاری بہت رو رہی تھی"

"بلونت کور کیوں رو رہی تھی، لہنا سنگھ نے تو اسے کچھ نہیں کہہ دیا؟"

"محلے والوں نے چاچا جی کے خلاف مقدمہ درج کرا دیا ہے"

"کیوں کوئی چوری وغیرہ تو نہیں ہو گئی محلے میں؟" برمنگھم کے گوروں کی مرغی بھی کسی کالے کے مرغے سے چھیڑ ڈال لیتی تو وہ سکھ پڑوسی کے خلاف مقدمہ درج کرا دیا کرتے تھے

"چوری نہیں ہوئی وہ چاچا جی رات پھر چیخیں مارتے ہوئے گلی میں نکل گئے تھے اور سارے محلے والے جاگ گئے تھے وہ پہلے بھی رات کو "بچاؤ! بچاؤ! وہ آ گئے ہیں انہوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی ہے دوڑو! بچاؤ!" کا شور مچاتے گلی میں نکل جایا کرتے تھے اور سارے محلے والوں نے مل کر کہا تھا کہ اگر پھر ہمیں تنگ کیا تو ہم پولیس میں رپورٹ کر دیں گے اور آج انہوں نے چاچا جی کے خلاف رپٹ لکھوا دی ہے آج تو بلونت کے بچے سکول بھی نہیں گئے، ہمیں ان کے لئے کچھ کرنا چاہیے" اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل گیا تھا

میں نے چائے کی پیالی وہیں رکھ دی گاڑی نکالی، بیوی کو ساتھ لیا اور بلونت کور کے گھر پہنچ گیا۔ لہنا سنگھ کے رویے کا مجھے پہلے ہی علم تھا بلونت بیچاری کا تو اس میں کوئی قصور نہیں ایسا نہ ہو

لہنا سنگھ کا بھی دماغ پھر گیا ہو۔ میں نے گھنٹی بجائی تو چاچا جی نے خود دروازہ کھولا۔ "آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے ہیں، آج ہمارے گھر راکھ کی بیٹی آئی ہے" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میری بیوی کے سر پر پیار دیا اور اونچی آواز میں چلانے لگے "اوہ بلونت کورے یہ دیکھ تیری بہن آئی ہے"

میری بیوی اندر چلی گئی تو چاچا جی نی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا مگر لہنا سنگھ مجھے کہیں نظر نہ آیا سوچا تھا نے گیا ہو گا، میں صوفے پر بیٹھ گیا چاچا جی نے اٹھ کر ڈرائنگ روم کے سارے دروازوں کو اندر سے کنڈیاں لگا دیں اور قالین پر بیٹھ کر اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ "مجھے معاف کر دیں" میں اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ میں جتنے زور سے اپنے پاؤں ان سے چھڑاتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ قوت سے میرے پاؤں پکڑ لیتے تھے بلونت کور نے دروازہ کھٹکھٹایا تو چاچا جلدی سے اٹھ کر میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئے میں نے کنڈی کھول دی وہ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر مڑی اور پھر دروازے میں رک گئی اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ چاچا جی نے ایک بار بھی آدھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ پیالی میں چائے ڈال کر اس میں کچھ تلاش کر رہے تھے

میں نے ایک دوست کو لندن ٹیلیفون کیا، اگلے روز اس نے بتایا کہ چاچا جی کو بڑے ہسپتال میں داخل کروانے کا انتظام ہو گیا ہے۔ میری بیوی بہت خوش ہوئی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ لہنا سنگھ سے کیسے بات کریں؟ مجھے ڈر تھا کہ وہ پھر بلونت کی ٹھکائی نہ کر دے میں نے اپنی بیوی کو تاکید کی کہ وہ بلونت کور سے اس بارے میں کوئی بات نہ کرے، میں خود ہی دو چار روز بعد اسے راضی کرنے کا کوئی طریقہ نکال لوں گا۔ اگلی دوپہر ہم میٹنگ میں تھے کہ سیکرٹری نے مداخلت کی معذرت چاہی اور ایک چٹ میرے سامنے رکھ کر باہر نکل گئی۔ میری بیوی کوئی ضروری بات کرنا چاہتی تھی، ایک منٹ کی اجازت لے کر میں دوسرے کمرے میں ٹیلیفون سننے گیا تو اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی "لہنا سنگھ نے تو چاچا جی کو دہلی کی پرواز پر واپس بھیج دیا ہے"۔ میرا سر چکرانے لگا بلونت کور پر کیا بیت رہی ہو گی؟ میں واپس آیا تو میٹنگ میں شامل سب کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے چاچا جی قالین پر میرے پاؤں پکڑے بیٹھے ہیں اور معافی مانگ رہے ہیں۔ مجھے لہنا سنگھ پر بہت غصہ تھا میں نے میٹنگ ختم کر دی۔ رات کو لہنا سنگھ نے ٹیلیفون کیا وہ بہت غصے میں تھا "یہ ساری مصیبت آپ کی وجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ہے میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ آپ ہم سے دور ہی رہیں''

ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا ہوسکتا ہے میری بیوی نے کوئی ایسی ویسی بات کردی ہو اس کے چاچا جی نے اسے کہا جو تھا کہ تم دونوں بہنیں مل کر اپنے خاوندوں کی چغلیاں کیا کرو ضرور کوئی ایسی بات ہوگئی ہوگی میں ابھی اسی سوچ میں گم تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔ گھنٹی چیختی رہی اور میں گم صم بیٹھا رہا ''آپ ریسیور کیوں نہیں اٹھاتے؟'' میری بیوی نے پریشانی سے پوچھا۔

''تم خود ہی سن لو، تمہاری کسی سہیلی کا ہی ہوگا'' میں نے لہنا سنگھ کا غصہ اس پر اتارتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ''ہیلو'' کہتے ہی پریشان ہوگئی ''کب؟ کب؟ اب کیا حال ہے؟ اللہ خیر کرے! اللہ انہیں زندگی دے! آپ فکر نہ کریں'' اس نے ریسیور مجھے پکڑا دیا۔ میرے بڑے بھائی کو پاکستان میں دل کا شدید دورہ پڑ گیا تھا اور اس کی حالت بہت خراب تھی میری دماغ کی سکرین پر سے چاچا رنجن سنگھ بلونت کور اور لہنا سنگھ سب صاف ہوگئے اور میں اپنے بھائی کے غم میں ڈوب گیا۔

ہسپتال میں اپنے بھائی کے پاس بیٹھا میں جب بھی کبھی اپنے بیوی بچوں کے بارے میں سوچتا تھا تو بلونت کور اور لہنا سنگھ بھی میری سوچ میں داخل ہو جاتے تھے اور میں اس سوچ کی ڈوری پکڑ کر راکھ کے باغوں میں پہنچ جاتا تھا میرے آنے کی خبر سن کر بھائی نتھا بھی اپنی چٹائی سمیت ہسپتال آ گیا تھا اور ہم دونوں رات کو باری باری جاگ کر بھائی صاحب کی دیکھ بھال کی ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ نتھا ہمارا اکلوتا پھوپھی زاد تھا ساڑھے چھ فٹ قد، موٹی موٹی آنکھیں، لمبی ناک اور باریک باریک نقش۔ بچپن میں وہ مجھے انگلی پکڑ کر سکول چھوڑنے جایا کرتا تھا اور اگر کبھی میں روٹھ جاتا تھا تو وہ مجھے اٹھا کر اپنے کندھوں پر سوار کر لیا کرتا تھا۔ اس کی ناک میں دونوں طرف بڑے بڑے سوراخ تھے اور میں اس کے کندھوں پر سوار سوچا کرتا تھا کہ اگر ان سوراخوں میں بھی اونٹ جیسی نکیل ہو تو میں ان کی نکیل کھینچ لوں۔ بھائی نتھے کی نہ بیوی تھی اور نہ ہی کوئی بچہ تھا اور اس کی مجھے بہت خوشی ہوا کرتی تھی کیونکہ ان کا سارا پیار محبت جو میرے اکیلے کے حصے میں آ گیا تھا۔ وہ میری ماں سے بھی زیادہ مجھے پیار کرتا تھا۔ بھائی جی بہت ہی کم بولتے تھے لیکن میرے ساتھ وہ باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ ہسپتال میں بھی وہ ہر وقت خاموش بیٹھے رہتے تھے اور اگر کبھی کوئی بات کرنی پڑ جائے تو وہ خاموشی سے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر

لان میں لے جایا کرتے تھے۔ ایک رات ہسپتال کے لان میں چاندنی کی چادر پر بیٹھے میں نے بھائی نتھا سے پوچھا ''آپ راکھ کے نرنجن سنگھ کو جانتے ہیں؟''

''نہیں! نہیں! میں کسی نرنجن سنگھ کو نہیں جانتا'' وہ چلائے اور اٹھ کر وارڈ کی طرف چل دیئے۔

''وہ تو کہتے تھے ہمارے باپ دادا ایک ہی ہوتے تھے وہ وہاں برمنگھم میرے پاس آئے تھے''

انہوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو اور وارڈ کی طرف جاتے جاتے ''تم چلو میں ابھی آتا ہوں'' کہہ کر واپس مڑ گئے۔

ساری رات گزر گئی اور وہ واپس نہ آئے۔ میں بڑے بھائی کو کیا بتاتا؟ وہ تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ انہیں اکیلا چھوڑ کر میں بھائی نتھے کو تلاش کرنے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میرا تو اپنا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اگلا دن بھی گزر گیا اور وہ نہ آئے مجھے محسوس ہونے لگا کہ مجھے بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ عصر کے وقت گاؤں سے ملنے والے آئے تو انہوں نے بتایا کہ بھائی نتھا تو گاؤں میں تھا۔

اللہ نے کرم کیا بھائی صاحب ٹھیک ہوگئے۔ گاؤں واپس جا کر ہم نے ان کی صحت کی خوشی میں دیگیں بانٹیں۔ عزیز رشتہ دار سب بہت خوش تھے مگر بھائی نتھے کا غصہ صاف محسوس ہوتا تھا۔ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ وہ تو میرے لئے باپ کی جگہ تھے۔ واپس آتے وقت میں انہیں ملنے گیا تو بھی وہ خاموش بیٹھے رہے نہ میرے سلام کا جواب دیا اور نہ ہی گلے لگا کر پیار کیا۔ میں سر جھکائے ان کے سامنے کھڑا رہا اور وہ خاموش بیٹھے مٹی پھرولتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، بڑے بھائی نے میرا بازو پکڑ کر کہا ''آؤ چلیں''۔

ہوائی اڈے سے گھر جاتے ہوئے میری بیوی نے حال احوال کے بعد جو پہلی خبر سنائی وہ یہ تھی کہ چاچا رنجن سنگھ کے بیٹے مہندر سنگھ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور بلونت کور ہر وقت روتی رہتی ہے مجھے بھارت کی پولیس کی بجائے اپنی بیوی پر غصہ آ گیا ''بلونت کور کے رونے کے علاوہ بھی کوئی اور خبر ہے یا ملکہ معظمہ کی بادشاہی میں بلونت کور کا رونا ہی سب سے بڑی خبر ہے''۔ میرے بیٹوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی ماں کی طرف اور خاموش ہوگئے۔ باقی سارا راستہ ہم میں سے کسی نے بھی اپنی زبان کھولنے کی مشقت نہ کی۔

سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوتا رہا اور میں اپنی آنکھوں پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضرورتوں کے کھوپے چڑھا کر زندگی کے کولہو کو کھینچتا رہا۔ میری بیوی اور بلونت کور ایک دوسری کو لمبے لمبے ٹیلیفون کرتی رہیں لیکن لہنا سنگھ جب بھی کبھی گلی بازار میں مجھے دیکھتا تھا منہ وٹ کر اس طرح پاس سے گزر جاتا تھا جیسے میں نے اس سے سیپ چھڑالی ہو۔ ایک صبح سویرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میری بیوی بچوں کو سکول چھوڑنے گئی ہوئی تھی اور میں ناشتے کے برتن دھو رہا تھا یہ بھی کوئی ٹیلیفون کرنے کا وقت ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ گھنٹی لڑاکی پڑوسن کی مانند چیخنے سے باز ہی نہیں آ رہی تھی ''ہیلو'' میں نے ریسیور اٹھا کر روکھی آواز میں کہا۔

''بھائی جی مبارک ہو مہندر سنگھ کو امریکہ کا ویزا مل گیا ہے اس نے ابھی ابھی سنگاپور سے مجھے ٹیلیفون کیا ہے اور تاکید کی تھی کہ بہن جی کو بتا دینا'' بلونت کور بڑی خوش تھی۔

بھارت کی پولیس اور مہندر سنگھ کے آپس کے لڑائی جھگڑے کے بارے میں اس دن کے بعد سے میری بیوی نے کبھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی میں نے اس بارے میں اس سے کبھی کچھ پوچھا تھا ''بھائی جی مہندر سنگھ جیل سے بھاگ گیا تھا اور کافی دیر اس کا کوئی پتہ ہی نہیں چل رہا تھا پھر وہ کسی طرح سنگاپور پہنچ گیا تھا اب اسے امریکہ کا ویزا مل گیا ہے'' بلونت کور نے اپنی خوشی کا سبب بیان کیا۔

مجھے بہت شرم آئی، چاچا رنجن سنگھ اتنی مصیبت میں رہے اور میں نے ٹیلیفون تک نہ کیا۔ بلونت کیا سوچتی ہوگی ہمارے بارے میں شام کو میں نے اپنی بیوی کو مٹھائی دے کر اس کے گھر بھیجا۔ اس نے واپس آ کر بتایا کہ لہنا سنگھ بھی میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مجھے لہنا سنگھ کی خوشی تو سمجھ میں آ گئی مگر اس کے غصے کی وجہ پھر بھی سمجھ نہ آئی۔

پھر ایک دن خبر آئی کہ بھائی نتھے کو بھی اگلے جہان کا ویزہ مل گیا تھا اور وہ چپ چپیتے ٹکٹ کٹوا کر اس جہان سے چلے گئے ہیں، نہ کسی کو کچھ بتایا اور نہ ہی کسی سے پانی کا گلاس مانگا، سوئے تو ٹھیک ٹھاک تھے صبح ملازم کنڈی کھڑکا تا رہا دروازہ کھولا تو وہ اپنا جسد خاکی اپنی نشانی چھوڑ کر جا چکے تھے

بلونت کور بھائی نتھے کی موت پر بہت روئی ''میریا ویرا تو نے تو اپنے پیچھے کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑی جیسے آیا تھا ویسے ہی اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ میریا ویرا میں تیری قبر کی نشانی کس سے پوچھوں'' بلونت لمبا گھونگھٹ نکال کر بین کر رہی تھی اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر برمنگھم کے آسمانوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی بھر آیا، پاؤں

کانپنے لگے تو میں نے جلدی سے کھلی کھڑکی کے دونوں پٹ پکڑ لئے۔ باہر دھند ہی دھند تھی، زمین سے آسمان تک گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ باہر بلونت کور بین کر رہی تھی اور اندر میں آنکھیں بند کر کے بھائی نتھے کی کوئی نشانی ڈھونڈ رہا تھا۔ راکھ کے کھیتوں اور باغوں میں گھومتا پھرتا میں اس حویلی کے قریب پہنچ گیا جس کے اندر ''آ کی رہے نہ کو'' کے نعرے گونج رہے تھے میں گنے کے کھیتوں میں چھپتا چھپاتا حویلی کی دیوار پر چڑھ گیا حویلی میں ایک اکیلا بندہ بہت سے حملہ آوروں سے لڑ رہا تھا اسے پندرہ بیس گھوڑ سواروں نے گھیرا ہوا تھا سواروں کے ہاتھوں میں نیزے اور کرپانیں تھیں اور وہ ڈانگ سے ان سب کا مقابلہ کر رہا تھا وہ کسی کے گھوڑے کے منہ پر اور کسی کی ٹانگوں پر ڈانگیں مار رہا تھا اور گھوڑ سوار قہقہے لگا رہے تھے وہ اس پر نہ تو تلوار سے حملہ کرتے تھے، نہ کوئی اسے نیزا مارتا تھا بس ارد گرد کھڑے تھے سواروں کی ایک ٹولی پیچھے ہٹ جاتی تو دوسری اسے گھیر کر قہقہے لگانے لگتی تھی جب وہ لڑتا لڑتا نڈھال ہو گیا تو سواروں نے مل کر ''آ کی رہے نہ کو'' کا نعرہ لگا کر سب گھوڑے اس پر چڑھا دیئے وہ لڑکھڑایا اور ڈانگ اس کے ہاتھ سے دور جا گری اس نے ڈانگ پکڑنے کی کوشش کی تو چار پانچ سواروں نے چھلانگیں لگا کر اسے قابو کر لیا انہوں نے اسے رسیوں میں باندھ کر حویلی کے درمیان میں پھینک دیا اور چاروں طرف کھڑے ہو کر قہقہے لگانے لگے ''او جان محمد! بلا اب اپنے باپ کو دے اپنے سورے باپ کو آواز کہ وہ آ کر تجھے چھڑائے، کہاں ہے تیرا باپ؟ بلا اسے''

ایک بندے نے اسے نیزے کی چونبڑ دیتے ہوئے کہا

''جتھیدارا میری رسیاں کھول کر اب بھی ایک ایک میرے سے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔۔۔'' اس نے کہا۔

جتھیدار نے قہقہہ لگایا اور اسے نیزے سے ایک اور جونبڑ دی ''تیرے باپ کی بوٹیاں تو ہم ان کھیتوں میں بکھیر آئے ہیں جن کی وٹ پر سے بھی وہ کسی کو گزرنے نہیں دیا کرتا تھا مگر تمہاری ہم بوٹیاں بھی نہیں کریں گے'' پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا ''کھڑے دیکھ کیا رہے ہو لاؤ اس کی بیوی کو ڈھونڈ کر اور اس کی ٹانگیں اٹھا کر۔۔۔''

اس کے ساتھی رہائشی مکانوں کی طرف دوڑے، انہوں نے ایک ایک کمرے کی تلاشی لی مگر جان محمد کی بیوی کہیں نہ ملی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوئی بات نہیں تیل چھڑک کر لگا دو آگ جہاں بھی ہوگی پاکستان پہنچ جائے گی'' جتھیدار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور وہ پٹرول چھڑک چھڑک کر مکانوں کو آگ لگانے لگے

مکان جلتے رہے، رسیوں میں بندھا جان محمد آسمانوں کی طرف اٹھتے دھوئیں میں کچھ تلاش کرتا رہا، جتھیدار اور اس کے ساتھی قہقہے لگاتے رہے۔ ایک کالی سیاہ بدلی کہیں سے بھاگتی ہوئی آئی اور دھوئیں سے گلے مل کر رونے لگی اسی وقت کڑھ کی چھت پر پڑے چھاپوں میں سے ایک خاتون نکل آئی جتھیدار کے ساتھی اس کی طرف دوڑے اس نے بڑے اطمینان سے اپنے دو بیٹوں کے منہ چومے اور انہیں پیچھے گنے کے کھیت کی طرف اتار دیا۔ سکھ تلواریں لہراتے اس کے قریب پہنچ گئے تھے اس نے آسمان کی طرف دیکھا، دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور جلتی آگ میں چھلانگ لگا دی۔ رسیوں میں بندھے جان محمد نے ''اللہ تیرا شکر ہے'' کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سکھ چھ اور چار سال کے اس کے دونوں بیٹوں کو کماد کے کھیت سے ڈھونڈ لائے ''ہم ان کی ماں سے ان کی جدائی کا دکھ نہیں برداشت کر سکتے، پہنچا دو انہیں بھی ان کی ماں کے پاس'' جتھیدار نے ایک اور قہقہہ لگایا

بیٹے ''ابا! ابا!'' چلاتے رہے، رسیوں میں بندھا جان محمد دیکھتا رہا اور انہوں نے دونوں لڑکوں کو ان کی ماں کے پاس پہنچا دیا۔ جان محمد کی آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا، اس نے اپنے لب سی لئے تھے

سکھوں نے مل کر ''آ کی رہے نہ کو'' کا نعرہ لگایا اور رسیوں میں بندھے جان محمد کو گھوڑے پر لاد کر قہقہے لگانے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بلونت کور ابھی تک ''میریا ویرا توتے اپنے پیچھے کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑ کر گیا'' کے بین کر رہی تھی

مگر وہ تو جان محمد تھا اور بلونت کور بھائی نتھے کی نشانی ڈھونڈ رہی تھی۔ نتھا جو اس کا چچا زاد تھا ہمارا اور نرنجن سنگھ کا گاؤں بھی ایک ہی تھا پردادا چھکڑ دادا بھی ایک ہی تھے۔ قوم بھی ایک ہی تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے کیس منڈوا لئے تھے اور نرنجن سنگھ کے بزرگوں نے ابھی تک اپنے کیس نہیں منڈوائے تھے۔ میں بلونت کا دکھ کیسے بانٹوں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا

ایک روز میں بیٹھا اپنے بھائی کا لکھا وہی خط پھر سے پڑھ رہا تھا جس میں انہوں نے

بھائی نتھے کی موت کی کہانی لکھی تھی کہ سیکرٹری نے بتایا کہ ایک سکھ نوجوان مجھے ملنا چاہتا ہے ''بھیج دیں'' کہہ کر میں نے اپنے بھائی کا خط جیب میں رکھ لیا۔ بیس بائیس سال کا ایک سکھ نوجوان دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس نے بہت قیمتی تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ریشمی ٹائی سر پر کیسری رنگ کی پگڑی اور ناک پر سنہری شیشوں والی عینک ''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا ''خیر کوئی ہوگا'' میں نے آپ ہی اپنے کو جواب دیا ''مگر یہ لنگڑا کیوں رہا ہے؟'' ''کہیں گاڑی مار دی ہوگی اس نے بھی سکھ نوجوانوں کو دارو چڑھ جائے تو وہ اپنے اوپر بھی قابو نہیں رکھ سکتے برمنگھم کی تو پولیس بھی سکھ نوجوانوں سے بہت تنگ ہے؟'' میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا۔ نوجوان نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور دروازے میں کھڑا رہا ''بیٹھو بھائی کھڑے کیوں ہو؟''

وہ کرسی میں جیسے تیسے گر گیا اور فرش میں نظریں گاڑھ کر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ کافی دیر بعد اس نے مردہ آواز میں کہا ''بھائی جی ہمیں معاف کر دیں''

میں نے حیرانی سے پوچھا ''کیا معاف کر دوں میں آپ کو؟''

''مجھے باپو نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں اپنے سارے خاندان کی طرف سے آپ کے سارے خاندان سے معافی مانگوں''

''کون ہے آپ کا باپ؟''

''نرنجن سنگھ راکھ والا''

''جتھیدار نرنجن سنگھ؟''

''ہوتا تھا وہ کبھی جتھیدار اب تو وہ کچھ بھی نہیں وہ اپنے کئے کی آگ میں جل رہا ہے پھر بھی نجات کی کوئی راہ نہیں مل رہی اسے''

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور راکھ کے کھیتوں اور باغوں سے دوڑتا ہوا اسی حویلی کی دیوار پر چڑھ گیا جس کو اندر سے ''آ کی رہے نہ کو'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور ایک اکیلا بندہ رسیوں میں بندھا ہوا حویلی کے درمیان پڑا تھا اور ڈیڑھ دو درجن سوار اس کو گھیرے کھڑے تھے اور نرنجن سنگھ جتھیدار پاس کھڑا قہقہے لگا رہا تھا اور انہوں نے پٹرول چھڑک کر مکانوں کو آگ لگا دی تھی اور ایک عورت نے اپنے دونوں ہاتھ آسمانوں کی طرف اٹھا کر دعا کی تھی اور پھر جلتی آگ میں چھلانگ لگا دی تھی اور جتھیدار کے حکم سے اس کے دونوں بیٹوں کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلتی آگ میں پھینک کر انہوں نے ''آ کی رہے نہ کو'' کے نعرے لگائے تھے اور پھر وہ اس رسیوں میں بندھے بندے کو گھوڑے پر لاد کر لے گئے تھے میں دیوار سے چھلانگ لگا کر گنے کے کھیتوں اور آم کے باغوں میں چھپتا ہوا بر منگھم پہنچ گیا

''باپو تو رات کو سو بھی نہیں سکتا، آنکھ لگتے ہی وہ چلا اٹھتا ہے، بچاؤ! بچاؤ! وہ آ گئے ہیں۔ دوڑو بھاگو انہوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ لوگوں بھاگو میرے بال بچوں کو بچاؤ'' چلاتا ہوا وہ گھر سے باہر کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔''

''جان محمد کہاں ہے؟ جسے وہ رسیوں میں باندھ کر لے گئے تھے؟''

اس نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا ''آپا بلونت نے تو مجھے ٹیلیفون کیا تھا کہ بھائی جان محمد فوت ہو گیا ہے اور باپو نے ہدایت کی تھی کہ میں فوراً بر منگھم پہنچ کر آپ سے معافی مانگوں''۔

''بھائی جان محمد فوت ہو گیا ہے؟ بلونت کور کو غلطی لگی ہے وہ تو بھائی نتھا فوت ہوا ہے، بلونت کور بھی اس روز بھائی نتھے کے ہی بین کر رہی تھی''

وہ اٹھا اور پگڑی اتار کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا ''بھائیا جی آپ میرے سر میں اور کتنے جوتے مارنا چاہتے ہیں، جتنے آپ کا دل چاہے ماریں میرے سر میں جوتے''

میں نے اپنے بھائی کا خط نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا

''مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے میرا باپ ہی بھائی جان محمد کے نک میں نتھ ڈال کر کئی روز تک اسے اردگرد کے دیہات میں گھماتا رہا تھا میں سب کچھ جانتا ہوں اور پھر وہ اسے کیمپ میں چھوڑ آئے تھے''

تمہارے باپ نے میرے بھائی کو کیمپ میں پہنچا کر اسے پیغام کیا دیا تھا وہ بھی تو اس نے تمہیں بتایا ہو گا؟''

''جتھیدار نرنجن سنگھ نے جان محمد سے کہا تھا کہ پاکستان جا کر اپنی ناک میں نتھ کی یہ دونوں موریاں لوگوں کو دکھایا کرنا لیکن جتھیدار نرنجن سنگھ کا بیٹا تو وہ موری کسی کو دکھا بھی نہیں سکتا جو انہوں نے تھانوں میں لوہے کی سلاخیں پھیر پھیر کر بہت بڑا ''مگ'' بنا دی ہے''۔ مہندر سنگھ نے کہا اور سر ڈال کر میرے پاؤں میں خاموش بیٹھا رہا۔ میرا سیکرٹری بار بار گھنٹی بجا رہا تھا۔ مہندر سنگھ نے اپنی پگڑی اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی اور ایک بار پھر ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا ''بھائیا جی ہمارا اور آپ کا مڈھ ایک ہے، خون ایک ہے، مٹی ایک ہے کیا ہم آپس

کے پھٹ سی نہیں سکتے؟''

''بیٹا اگر مٹی ملنے سے تاریخ کے پھٹ سیئے جا سکتے تو آج آپ امریکہ میں مٹی نہ چھانتے پھر رہے ہوتے''

وہ بوہا کھول کر باہر نکل گیا لیکن اب وہ پہلے سے بھی زیادہ لنگڑانے لگا تھا۔

میں نے اپنی بیوی کو اپنے بھائی کے خط کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا میں اسے مہندر سنگھ کی دعوت اور ٹکٹوں کے بارے میں بھی نہیں بتا سکوں گا باہر سڑکوں پر روشنیاں ہی روشنیاں ہیں مگر مجھے واپسی کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا میں جس طرف قدم اٹھاتا ہوں بھائی نتھا سامنے کھڑا آن ہوتا ہے۔ میری بیوی بار بار ٹیلیفون کر رہی تھی اور آئینہ کہتا ہے ابھی گھر نہ جانا۔ (پنجابی میں لکھی کہانی کا ترجمہ)

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹا بھائی

میں نے اپنے گال پر پورے زور سے چٹکی لی اپنے سر پر دو تین مکے مارے دل اور دماغ دونوں ٹھیک ٹھاک تھے رومال سے آنکھیں صاف کر کے بایاں ہاتھ پھیلا کر عمر کی لکیر پڑھی آنکھیں بھی ٹھیک تھیں اور عمر کی لکیر کے مطابق بھی میں ابھی زندہ تھا

میں ابھی زندہ ہوں میری آنکھیں ٹھیک ہیں دل کام کر رہا ہے دماغ چوٹ کا جواب دیتا ہے تو پھر ہوا کیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گوردوارہ جنم استھان اس کی اونچی ڈیوڑھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بنوایا مہمان خانہ اور بوڑھے بابے درخت سب کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ ابھی سب تھے اور اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا نہ کوئی لال اندھیری آئی تھی اور نہ ہی زلزلہ سے زمین پھٹی تھی تو پھر ہو کیا گیا ہے؟ میں زندہ ہوں میری آنکھیں، دل اور دماغ سب ٹھیک کام کر رہے ہیں اور گوردوارہ جنم استھان اس کی درشنی ڈیوڑھی رنجیت سنگھ کا بنوایا مہمان خانہ اور بوڑھے بابے درخت مجھے کچھ بھی دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟

وہ بابا گورونانک جی کا جنم دن تھا۔ دھرتی کے کونے کونے سے باباجی کے ماننے والوں کے جتھے ننکانہ صاحب آئے ہوئے تھے۔ بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور بچے میرے ہر طرف یاتری ہی یاتری تھے جن کے چہروں پر سے امن اور شانتی ٹپک رہے تھے۔ یاتریوں کے چہروں پر سے بوڑھے بابے درختوں سے مکانوں اور منڈھیروں سے ہر طرف نہائی دھوئی شانتی برس رہی تھی اور میں اس گوڑھی شانتی کے سائے سائے گوردوارہ جنم استھان کی بڑی

سڑک پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اور میرے سامنے سے سب کچھ غائب ہو گیا تھا اور مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ''بھاگو! بھاگو! سکھوں نے ایک مسلمان کو مار دیا ہے'' ایک طرف سے آواز آئی تھی اور میرے سامنے کی ہر چیز ملیا میٹ ہو گئی تھی

نہیں! نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا آج تو بابا گورونانک جی کا جنم دن ہے آج کوئی سکھ اپنے گورو کے جنم استھان میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا

لیکن جب میری آنکھوں کے سامنے سے ہر چیز ملیا میٹ ہو گئی گوردوارہ جنم استھان، درشنی ڈیوڑھی رنجیت سنگھ کا بنوایا مہمان خانہ شانتی پوش یاتری کچھ بھی باقی نہ بچا تو میرا دل ڈولنے لگا ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے یہاں بھی سکھوں نے کسی مسلمان کو قتل کر دیا ہو میری سوچ کانپنے لگی

''دوڑو! دوڑو! بچاؤ! بچاؤ! سکھوں نے ایک مسلمان قتل کر دیا ہے'' آواز پھر گونجی

تھوڑی دور کچھ سکھ یاتری سر جوڑے بیٹھے اور کھڑے تھے اور ان کے پاس کھڑا لڑکا چلا رہا تھا ''دوڑو، بچاؤ سکھوں نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا ہے'' ایک سکھ یاتری اپنے بازوں بلند کر کے اس لڑکے سے بھی اونچی آواز میں چلایا ''سنو بھائیو سنو! کسی نے کسی کو قتل نہیں کیا کچھ بھی نہیں ہوا بس ذرا ایک مسلمان بھائی گر گیا ہے''

یاتریوں کی اس ٹولی کے درمیان ایک نوجوان سکھ ایک بوڑھے کا سر اپنی گود میں لئے بیٹھا تھا نوجوان سکھ کی کیسری رنگ کی پگڑی کھل کر اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ایک سکھ زمین پر بے ہوش پڑے بوڑھے کے پاؤں کے تلووں پر اپنے ہاتھوں سے مالش کر رہا تھا اور ایک پاس کھڑا اپنے بازو اوپر اٹھا کر چلا رہا تھا۔ ''سنو بھائیو! سنو کسی نے کسی کو قتل نہیں کیا کچھ بھی نہیں ہوا بس ذرا ایک مسلمان بھائی گر گیا ہے''

گوردوارے کے پوتر تالاب میں یاتری اشنان کر رہے تھے۔ عورتیں، مرد، لڑکے، لڑکیاں، بچے، بوڑھے سب اپنے پاپ مل مل کر اپنے جسموں اور روحوں سے الگ کر رہے تھے اور ان کے گیلے کیسوں اور کپڑوں سے امن اور شانتی ٹپک رہے تھے اور نوجوان سکھ بوڑھے مسلمان کا سر گود میں لئے پریشان بیٹھا تھا دوسرا سکھ اپنے ہاتھوں سے اس مسلمان کے پاؤں کے تلووں پر مالش کر رہا تھا اور ان کی کیسری پگڑیاں کھل کر ان کی گردنوں کے گرد لپٹ گئی تھیں اور وہ بہت پریشان تھے

''چاچا رحمو!'' بے ہوش بوڑھے کو دیکھ کر میری تو جیسے چیخ ہی نکل گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھلی پگڑیوں والے سکھوں نے حیرانی اور پریشانی میں میری طرف دیکھا اور بھی بہت سے یاتریوں نے میری چیخ سن لی تھی لیکن چاچا رحموا سی طرح بیہوش اور بے سدھ پڑا رہا اسے نہ اپنے آپ کا ہوش تھا اور نہ ہی کھلی پگڑیوں والے سکھ یاتریوں کی پریشانی کا کچھ پتا تھا۔ نوجوان سکھ نے ایک بار پھر مجھے گھورا اور چاچا رحمو کی دندل توڑنے کے جتن کرنے لگا اس کے چہرے اور حالت سے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ چاچا رحمو کو ہوش نہ آیا تو وہ بھی ہوش و حواس کھو دے گا۔

''یہ آپ کا بھی چاچا ہے''؟ ایک یاتری نے آہستہ سے پوچھا

''ہاں یہ ہمارا چاچا رحمو ہے'' میں نے چاچا جی کے اور بھی قریب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''آؤ پھر ہمارے ساتھ مل کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے سر ہی پڑ جائے مگر اسے ہوا کچھ نہیں بس ذرا ٹھوکر لگنے سے گر گیا تھا کہا اسے کسی نے کچھ نہیں آؤ تھوڑی زحمت کرو اور اسے ہوش میں لانے میں ہماری مدد کرو'' یاتری نے اس انداز میں سرگوشی کی جیسے اس کی اپنی آنکھیں بھی بند ہونا شروع ہو گئی ہوں اس کے ہوش و حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہوں۔

میں بہت سالوں بعد گوردوارہ جنم استھان کے اندر گیا تھا۔ بہت سال پہلے جب ہم نے مڈل کا امتحان دیا تھا تو ہمارا سنٹر گورنانک ہائی سکول ہی بنا تھا اور میں گورونانک ہائی سکول کی عمارت کے ناک نقشہ سے گورونانک جی کو پہچاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ سکول کی لمبی چوڑی عمارت کے چاروں کونوں پر بڑے خوبصورت نانک شاہی برج تھے بڑے ہال کے سامنے کی ڈیوڑھی نے اپنے سر پر اونچی کلغی والی پگڑی باندھ رکھی تھی سکول کی عمارت کے چاروں طرف بڑے بڑے میدان تھے اور ان سے آگے دور دور تک سنگترے اور مالٹے کے باغ پھیلے ہوئے تھے اور ہر طرف شانتی سی اتری ہوئی محسوس ہوا کرتی تھی اور میں نے امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی گورنانک ہائی سکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر پھر گوردوارہ جنم استھان کی یاترا کے بعد میں نے اپنا وہ فیصلہ واپس لے لیا تھا اور اس کے بعد مجھے اس گردوارہ سے خوف آنے لگا تھا۔

امتحان ختم ہو گیا تو ماسٹر جی نے ہمیں ننکانہ شہر کی یاترا کرانے کا پروگرام بنا لیا ہم ایک سارا دن گوردوارہ گوردوارہ گھومتے رہے چھوٹے سے ننکانہ صاحب میں اتنے زیادہ

گوردوارے دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے تھے مگر گوردوارہ جنم استھان دیکھ کر مجھے ان گوردواروں سے خوف آنے لگا تھا اور اس کے بعد سے اس گوردوارے کے اندر جانے کی مجھے کبھی ہمت نہیں پڑی تھی۔ گوردوارہ جنم استھان کے سنہری ٹوپی والے کمرے میں رکھے گرنتھ صاحب کو متھا ٹیکنے کے بعد گوردوارے کی یاترا کرانے والے سردار جی ہمیں ایک بوڑھے درخت کے قدموں میں لے گئے ''یہ وہ جگہ ہے جہاں جتھیدار پچھمن سنگھ کو زندہ جلا دیا گیا تھا'' انہوں نے بتایا اور آگے چل پڑے۔ تھوڑا اور آگے جا کر اپنا سر جھکا لیا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس جگہ ایک کمہار کی مٹی کے کچے برتن پکانے کی بھٹی ہوتی تھی اور دلیپ سنگھ کو اس بھٹی میں زندہ جلا دیا گیا تھا'' تھوڑا آگے گئے تو بتایا ''یہاں کمہاروں کی برتن پکانے کی بہت بڑی بھٹی ہوتی تھی اور انہوں نے دو سو اسی سکھ سورماؤں کو اس بھٹی میں زندہ جلا دیا تھا'' سردار جی ہمیں گوردوارہ جنم استھان کی ایسے یاترا کراتے اور مختلف جگہوں کے بارے میں بتاتے پھر رہے تھے جیسے کوئی پیشہ ور گائیڈ سیاحوں کو ہڑپہ کے آثار میں لئے پھر رہا ہو اور اپنی دہاڑی بنا رہا ہو مگر میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا میرا اپنا جسم آگ میں جلنے لگا تھا اور شعلے تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ''مہنت نرائن داس نے اس بھٹی میں دو سو اسی سکھوں کو اس روز زندہ جلا دیا تھا'' سردار جی نے بتایا۔

ایک مکان کی چھت اور دیواروں میں گہرے گڑھے تھے۔ ''یہ ان گولیوں کے نشان ہیں جو مہنت کے آدمیوں نے سکھوں کو ماری تھیں''

''مہنت کون تھا؟'' ایک لڑکے نے سردار جی سے پوچھا ''وہ سکھ نہیں تھا''

''نہیں جی مہنت نرائن داس سکھ نہیں ہندو تھا اور سکھ اس سے گوردوارے واپس لینا چاہتے تھے''

''بابا گرو نانک جی کے جنم استھان پر ہندو مہنت کیوں قابض تھا؟ بابا گورونانک جی ہندو تھے؟''

سردار جی نے اس سوال کا بہت لمبا چوڑا جواب دیا تھا جس میں سے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا اور میرے اندر کی آگ اور بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ رہ داس کے اڑائے میں جو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کیا کرتے تھے وہ سب تو ہندو مہنت کی حویلی میں مقیم ہوتے تھے اور وہاں سے نکل کر پاکستان کے مسافروں پر حملے کیا کرتے تھے اور ان سب سکھوں کو خوراک،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تلواریں، بندوقیں اور پناہ رمداس کا ہندو مہنت دیا کرتا تھا اور ننکانہ صاحب کے مہنت نے سکھوں کو زندہ جلا دیا تھا؟ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا تھا اور گوردوارہ جنم استھان سے واپس آتے ہی میں نے گرونانک ہائی سکول میں داخلہ نہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے بعد آج میں پہلی دفعہ گوردوارہ جنم استھان کے اندر آیا تھا اور چاچا رحمو گوردوارہ جنم ستھان کی بڑی سڑک پر بے ہوش پڑا تھا اور دو سکھ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی کیسری پگڑیاں کھل کر گلے میں پڑی ہوئی تھیں اور دنیا کے کونے کونے سے آئے سکھ یاتری پالکی کے جلوس کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہم نے مل کر چاچا رحمو کو اٹھایا تو اس کی سانس اکھڑ گئی اور نوجوان سکھ کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر مٹی میں ملنے لگے۔ دوسرے سکھ نے اسے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا ''حوصلہ کر ابھی تو پہلی مصیبت ہی ختم نہیں ہوئی تو کوئی نیا دکھ ڈال کر ہماری یاترا ہی برباد نہ کر دینا''

چاچا رحمو مٹی کی بوری تھا۔ نوجوان سکھ کے پاؤں ڈولنے لگے تو ہم نے مل کر اسے ایک دکان کے پھٹے پر لٹا دیا۔ نوجوان سکھ زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں کے تلوؤں پر اپنے ہاتھوں سے مالش کرنے لگا اور دوسرا یاتری سرہانے کی طرف کھڑا ہو کر کوئی منتر پڑھنے لگا۔

چاچا رحمو بھی کمہار تھا مگر اس نے کبھی بھٹی نہیں جلائی تھی برتن بنانے اور انہیں بھٹی چڑھا کر پکانے کا سارا کام اس کا بڑا بھائی لبھو کیا کرتا تھا اور خاموش رہنا اور لبھو کا ہر حکم ماننا رحمو کے ذمے ہوتا تھا۔ لبھو اس کا بڑا بھائی بھی تھا اور باپ بھی اس نے باپ کی موت کے بعد رحمو کی پرورش کی تھی اس کی شادی کی تھی اور اسے گدھے ہانکنا سکھایا تھا۔ رحمو کے لئے وہی سب کچھ ہوتا تھا اور وہ کبھی بھی اس کے سامنے بولنے کی گستاخی نہیں کیا کرتا تھا۔ سیپیوں کے کھیتوں میں گوبر کی کھاد ڈالنا ان کا غلہ گھر پہنچانا لبھو کے برتن بنانے کے لئے مٹی لانا اور گدھوں کی دیکھ بھال کرنا رحمو کے ذمہ ہوتا تھا اور برتن بنانے بھٹی چڑھا کر پکانے اور بیچنے کا سارا کام لبھو کیا کرتا تھا۔ لبھو کے بنائے بکھورے، سہنکیاں، ہانڈیاں، کنالیاں، منکے، مٹ اور دوسرے برتن ایسے مضبوط اور ہلکے پھلکے ہوتے کہ اردگرد کے دیہات میں اسی کی بھٹی کے برتن چلتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد لبھو بسم اللہ پڑھ کر چک پر بیٹھ کر جب اسے پاؤں سے حرکت دیتا تو اس پر جمائی مٹی اس کے ہاتھ چومنا شروع کر دیتی۔ ''اللہ تو! اللہ تو!'' کی اس کی آواز کے ساتھ چک کی حرکت بھی تیز ہوتی جاتی تھی اور مٹی لبھو کی مرضی کی شکلوں میں ڈھلنا شروع ہو جاتی۔ پہلی منزل کا سفر پورا کر کے سورج دوسری منزل میں قدم رکھتا تو لبھو چک پر سے پاؤں اٹھا لیتا۔ گیلے

برتن دھوپ میں رکھ کر وہ دھریک کے درختوں کی چاؤں میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے بنائے برتنوں کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں نور اتر آتا ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے آپ کو تھپکیاں دے کر اپنے سے اپنے فن کی داد وصول کر رہا ہو

لبھو کی حویلی لوہاراں والی کے راستے پر پراچے کی سب سے آخری حویلی تھی جس کے تین طرف کھیت تھے اور صرف ایک طرف کی دیوار ملک شرف دین کی خالی حویلی سے ملی ہوئی تھی جس کی تین دیواروں کے ساتھ ساتھ صفیں باندھے پھرواں کے بوڑھے بوڑھے درخت دن بھر ''ساں! ساں'' گاتے رہتے تھے۔ ملک صاحب زمینوں کا چکر لگانے آتے تو حویلی کا دروازہ کھلوا کر درختوں کا حال چال پوچھ کر واپس اپنے ''نواں پنڈ'' چلے جاتے۔ لبھو کمہار کی حویلی نوجوان سکھوں کے تمباکو پینے کا محفوظ ترین ٹھکانہ ہوتی تھی اردگرد کے کھیتوں میں کام کرنے والے سکھ دوپہر کے وقت لبھو کمہار کی حویلی میں جمع ہو کر حقہ سگریٹ پیتے اور لبھو کی دل موہ لینے والی باتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ لبھو کمہار پراچہ کے نوجوان سکھوں کا دوست بھی تھا اور پیر جی بھی جو باتیں وہ کسی اور سے نہیں کر سکتے تھے لبھو سے وہ بھی کر لیتے تھے اور عشق و عاشقی میں صلاح مشورہ بھی لبھو سے ہی کیا کرتے تھے اور لبھو کو اپنی حویلی میں دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے پراچہ اور اردگرد کے دیہات کے سارے لڑائی جھگڑوں کی خبریں مل جاتی تھیں جن باتوں کا نوجوان سکھوں کو علم نہیں ہوتا تھا وہ سب پرتاب سنگھ نمبردار انہیں بتا جایا کرتا تھا۔

پراچہ میں زمینوں کے مالک زیادہ تر سکھ تھے مسلمانوں میں سے بڑے مالک صرف ملک شرف دین تھے لیکن ان کی بھی زیادہ زمینوں کے سکھ مزارع موروثی مالک ہو گئے تھے اور جو زمینیں بچ گئی تھیں پراچہ کے بے زمین مسلمان کی کاری انہیں اپنی ہی سمجھتے تھے اگر کوئی سکھ کسی مسلمان کو اپنے کھیتوں میں سے گزرنے سے روکتا کسی مسلمان کا مال مویشی کسی سکھ کی فصل اجاڑتا اور سکھ اس سے کوئی اونچی بات کرتا تو وہ دبنے کی بجائے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتا۔ ''اگر میں نے تمہیں اپنے ملک صاحب کے کسی کھیت کی وٹ پر سے گزرتے دیکھ لیا تو میں تم سے نپٹ لوں گا''۔ ملک صاحب کی حویلی، مکانوں اور فصلوں کی پراچہ کے مسلمان ایسے دیکھ بھال کیا کرتے تھے جیسے وہ ان کی اپنی ہی ہوں۔ ایک روز ملک صاحب نے رحمو سے کہا۔ ''یہ چابی لو اور اپنی بیوی کے ساتھ اندر والے گھر میں رہائش کر لو'' تو رحمو کو کچھ سمجھ نہ آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم میاں بیوی وہاں رہو گے تو گھر کی صفائی اور دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی بند پڑے مکان گر رہے ہیں''

''پر ملک صاحب۔۔۔۔۔''

''رحمو جہاں دو برتن ہوں وہ بھی آپس میں ٹکرا جاتے ہیں کوئی بات نہیں لبھو تیرے لئے باپ کی مانند ہے''

رحمو نے خاموشی سے چابی پکڑ لی اسے تو کسی کے سامنے بولنا آتا ہی نہیں تھا بیویوں کی لڑائی بھائیوں کی جدائی بن گئی رحمو گھر سے کیا نکلا لبھو کے دل سے بھی نکل گیا۔ باپ کی ساری جائیداد میں سے لبھو نے رحمو کو صرف دو گدھے دیئے اور ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا ایک روز رحمو ہر دوروال کے مہتا جی کے پاس گیا ''مہتا جی بڑے بھائی نے میری بیوی کا زیور آپ کے پاس رکھا ہوا ہے''

پورن مہتا نے اسے ڈانٹ پلا دی ''تم کون ہو؟ میرے پاس تو کسی کی بیوی کا کوئی زیور نہیں''۔

''جی میں لبھو کا چھوٹا بھائی رحمو ہوں''

''ہو گے تم لبھو کے بھائی مجھے اس سے کیا غرض؟ میرا لین دین لبھو کے ساتھ ہے لبھو میرا بھائی ہے لین دین کا معاملہ ہم دونوں بھائیوں کے درمیان ہے تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے!''

ہر دوروال پراچہ سے کوئی زیادہ دور نہیں تھا درمیان میں ایک ہی تو گاؤں پڑتا تھا لوہاراں والی لیکن ہر دوروال سے واپس آتے ہوئے رحمو کے لئے پراچہ کا سفر ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اسے دیکھے بھالے راستے کھیت اور لوگ سب انجانے انجانے سے معلوم ہوتے تھے۔

ملک صاحب نے رحمو کو سمجھایا ''پورن مہتا بنیا ہے وہ تم دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے لڑانا چاہتا ہے تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے مجھے بتاؤ لبھو تمہارے لئے باپ کی مانند ہے اس سے اونچی بات نہ کرنا''

''ملک صاحب وہ تو میری بیوی کا۔۔۔۔۔''

''وہ تو ٹھیک ہے پر پورن بنیا ہے''

رحمو خاموش ہو گیا

پاکستان کا چرچا ہونے لگا تو بھی رحمو خاموش رہا وہ تو کسی سے کبھی کوئی بات ہی نہیں

کیا کرتا تھا بس کبھی اپنے گدھوں سے پورن مہتا کا شکوہ شکایت کر لیا کرتا تھا۔ رحمو کو نہ سیاست کی کوئی سمجھ تھی اور نہ ہی وہ پاکستان کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ پاکستان کا اعلان ہوا تو پراچہ اور نواں پنڈ پہلے پاکستان میں آئے اور پھر ہندوستان کا حصہ بنا دیئے گئے تو سکھوں کے تیور بدلنے لگے اور مسلمان جاگ جاگ کر راتیں گزارنے لگے

اس ساری رات پیارالی میں قافلے آتے رہے ویلا، مالیوال، تلونڈی راما، کٹھیالا ہر جگہ سے اور ہر طرف سے مسلمانوں کے قافلے آ رہے تھے علاقہ کے سارے مسلمان پاکستان جا رہے تھے اور پیارالی میں اکٹھے ہو رہے تھے اور پراچہ کے سارے مسلمان بھی پیارالی چلے گئے تھے مگر لبھو بال بچوں سمیت پراچہ میں ہی تھا۔ رات گزر گئی صبح ہو گئی مگر نہ لبھو آیا اور نہ ہی اس کے بیوی بچوں میں سے کوئی پیارالی پہنچا۔ رحمو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کسی سے بات تو اس نے کبھی کی نہیں تھی۔ بیوی بچے وہیں چھوڑ کر وہ چپکے سے پراچہ پہنچ گیا۔ لبھو اپنی حویلی میں اپنے بوڑھے اور نوجوان سکھ مریدوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کا چک خاموش تھا چک کے اوپر جمائی مٹی سوکھ رہی تھی اور لبھو ''اللہ تو اللہ تو'' کے ورد کی بجائے خاموش بیٹھا تھا اور سکھ قہقہے لگا رہے تھے لطیفے سنا رہے تھے مگر لبھو اور اس کا چک خاموش تھے اور چک پر جمائی مٹی سوکھ رہی تھی؟ رحمو نے نہ اپنے بھائی کو کبھی اس طرح خاموش دیکھا تھا اور نہ چک پر جمی مٹی سوکھتی دیکھی تھی۔ وہ کافی دیر تک کھڑا سکھوں کے لطیفے اور قہقہے سنتا رہا اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر درخواست کی ''بھائی جی مجھ سے جو بھی قصور ہوا ہے مجھے معاف کر دیں''

لبھو نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا

رحمو نے بڑے بھائی کے پاؤں پکڑ لئے ''بھائی جی مجھے معاف کر دیں اور میرے ساتھ چلیں سب لوگ پاکستان جا رہے ہیں''۔ اس کا خیال تھا کہ لبھو اس سے ناراضگی کی وجہ سے ہی ابھی تک یہیں بیٹھا ہے

''لبھو ہمارا بھائی ہے ہمارا پیر بھی ہے ہم کسی صورت اسے نہیں جانے دیں گے اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے کو ہماری لاشوں کے اوپر سے گزرنا ہو گا'' پرتاب سنگھ نمبردار نے اپنی کرپان ہوا میں لہرائی

لبھو نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموش اپنے چک اور اس پر جمائی خشک ہوتی مٹی کو دیکھتا رہا

رحمو نے اپنی پگڑی لبھو کے قدموں میں رکھ دی۔ ''بھائی جی مسلمان تو سب پاکستان جا رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں دیر نہ کریں جلد پاکستان چلیں"

پرتاب سنگھ نے رحمو کی پگڑی اٹھا کر اس کے گلے میں ڈال دی "جاتے ہیں تو جائیں وہ اپنے پاکستان کو، کون روکتا ہے تمہیں! لبھو ہمارا بھائی ہے ہمارا پیر ہے یہ ہمارے پاس رہے گا اپنے باپ دادے کی قبروں کے پاس ان پر مٹی ڈالنے کے لئے لبھو اپنے باپ دادا کی قبروں سے بے وفائی نہیں کرے گا ہم کسی صورت اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتے"

لبھو خاموش بیٹھا رہا اور رحمو روتا ہوا پیارا لی کی طرف چل دیا

جب بھی بھارت سے سکھوں کے آنے کی خبر ملتی رحمو سارے کام کاج چھوڑ کر ننکانہ پہنچ جاتا اور سارا دن سڑکوں پر گھومتا رہتا بولنا تو اسے آتا نہیں تھا اس لئے وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ پراچہ سے بھی کوئی یاتری آیا ہے یا نہیں شام کو دکھی دل کے ساتھ واپس آتا تو اس کی بیوی اس کے گلے پڑ جاتی "مل گیا ہے وہ اونترا نکھترا لبھو تمہیں؟ پراچہ میں وہ ہمیں بھوکے مارنا چاہتا تھا اور تو اس کی محبت میں گدھے بھوک سے مار دے گا"

رحمو اس کی کسی گالی کا بھی کوئی جواب نہیں دیتا تھا

کیسری پگڑی والا سکھ نوجوان چاچا رحمو کے پاؤں کے تلوؤں پر اپنے ہاتھوں سے مالش کر رہا تھا دوسرا سکھ کوئی منتر پڑھ رہا تھا اور میں چاچا جی کی دندل توڑنے کی کوشش کر رہا تھا بڑی مشکل سے میں نے اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے ڈالے تو اس نے آنکھیں کھول دیں "تم کہاں سے آ گئے ہو"۔ اس نے مجھے پہچان کر پوچھا اور پھر چیخیں مارنے لگا "انہوں نے میرے بھائی کو آگ میں جلا دیا ہے میں تو ہر صبح اس کی بخشش کیلئے دعائیں کیا کرتا تھا مجھے بتاؤ میری ان دعاؤں کا کیا بنا۔ ان ۔۔۔۔ نے اسے بھی آگ میں جلا دیا اس کی بھی چتا جلا دی"۔ محسوس ہوتا تھا جیسے چاچا رحمو کے جسم میں بجلی دوڑ رہی ہو وہ تڑپ رہا تھا رو رہا تھا اور چیخ رہا تھا "لوگو مجھے بتاؤ میں کیا کروں میری دعائیں کہاں گئیں؟"

نوجوان سکھ نے اپنی کیسری پگڑی چاچا رحمو کے پاؤں پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا "چاچا جی اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"سارا قصور اس کے باپ پرتاب سنگھ کا ہے" چاچا جی نے دوسرے سکھ کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا "تمہارا باپ تو کہتا تھا کہ لبھو میرا بھائی ہے ایسے ہوتے ہیں بھائی؟ پورن مہتا کا بھی قصور ہے پر تجھے تو معلوم تھا کہ تمہارا باپ سکھ نہیں مسلمان ہے تم نے بھی نہ روکا کہ اسے

نہ جلاؤ" وہ اپنا سر دیوار سے مارنے لگا "لوگوں مجھے بتاؤ میں کیا کروں انہوں نے میرا بھائی آگ میں جلا دیا ہے اس کا باپ کہتا تھا لبھو میرا چھوٹا بھائی ہے وہ باپ دادے کی قبروں پر مٹی ڈالے گا اور اس بڑے بھائی نے اس کی قبر بھی نہ بننے دی"۔ گوردوارہ جنم استھان سے پالکی کا جلوس برآمد ہو رہا تھا سکھ یاتری سر جھکائے قطاریں باندھے گرنتھ صاحب کے پیچھے آہستہ آہستہ چلے آ رہے تھے انہوں نے چھوٹی چھوٹی کرپانیں بغلوں میں لٹکا رکھی تھی بوڑھے درختوں اور گوردوارے کی دیواروں پر سے شانتی ٹپک رہی تھی اور چاچا رحمو چیخیں مار مار کر رو رہا تھا اپنا سر دیواروں سے مار رہا تھا نوجوان سکھ نے اپنی کیسری پگڑی اٹھا کر گردن کے گرد لپیٹ لی اور چاچا رحمو سے لپٹ کر رونے لگا "چاچا جی مجھے معاف کر دو"۔ (پنجابی میں لکھی کہانی کا ترجمہ)

☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنیل سنگھ

بھینی میں رات گئے تک منادی ہوتی رہی ''سنئے حضور والا کیا کہتا ہے منادی والا سردار کرنیل سنگھ ولد سردار شیر سنگھ منادی کراتے ہیں کہ گاؤں کے تمام مسلمان اپنی اپنی پرچیاں کل مسلم لیگ کی صندوقڑی میں ڈالیں گے کسی کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں سردار کرنیل سنگھ اعلان کرتے ہیں کہ خضری پٹھوؤں نے کسی کو ڈرانے کی کوشش تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا'' منادی کرنے والا ''ہوگا'' کو اتنا لمبا کھینچتا کہ آواز سردار دلیر سنگھ کے محلوں کی برجیوں سے ٹکرا کر سارے گاؤں میں گونج جاتی۔

دوسرے روز بھینی اور ارد گرد کے دیہات کے سب مسلمان بلا کسی ڈر اور خوف کے مسلم لیگ کی صندوقڑیوں میں ووٹ ڈالتے رہے اور کرنیل سنگھ مسلم لیگ کے کیمپ پر ڈیوٹی دیتا رہا۔ بسیں خضری امیدوار کی بھر بھر کر آئیں صندوقڑیاں مسلم لیگی امیدوار کی بھری ہوئی نکلیں۔ ذیلدار اور سفید پوش دیکھتے رہ گئے۔ یونینسٹوں اور سکھوں کے حلقہ اثر سے مسلم لیگ کی شاندار کامیابی سے اور ایک خالص سکھ کے ایک خالص مسلمان کی مسلح حمایت پر سب حیران تھے کہ کرنیل سنگھ نے سکھ پنتھ کے فیصلے کی اتنی کھلی کھلی خلاف ورزی کیوں کی تھی؟ سکھ اور ہندو پوچھتے ''سردار کرنیل سنگھ یہ تم لیگی کیسے ہو گئے؟''

''میں تو لیگی نہیں میرا باپو لیگی ہے اس کا حکم تھا'' کرنل سنگھ جواب دیتا۔

کرنیل سنگھ نے نوعمری میں اپنے باپو سردار شیر سنگھ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور

ملک علی محمد کو باپو بنا لیا ہوا تھا اور وہ اپنے مسلمان باپو کے ہر حکم کی پابندی کیا کرتا تھا غریب مسلمان ووٹروں کے دل مسلم لیگ کے ساتھ تھے ان کے دلوں پر سے یونینسٹوں کا خوف دور کرنے کا حکم ملک صاحب نے دیا تھا اور کرنیل سنگھ نے مسلمانوں کے دلوں کا خوف خضری سیاہ وسفید پوشوں کے دلوں پر منتقل کر دیا تھا۔

''آپ نے کرنیل سنگھ کو اپنے باپ کو گولی مارتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' عدالت نے گواہ سے پوچھا۔

''نہیں میں نے اسے گولی مارتے نہیں دیکھا تھا'' گواہ نے جواب دیا۔ ''میں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا اور گولی کی صرف آواز سنی تھی میں نے شیر سنگھ کے منہ میں پانی ڈالا اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر اس نے دم توڑ دیا''۔

''آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ گولی مار کر جو سوار بھاگ گیا تھا وہ کرنیل سنگھ ہی تھا؟''

''نہیں''

عدالت نے شک کا فائدہ دے کر کرنیل سنگھ کو بری کر دیا۔

بھینی ڈھلوان کے دو بڑے مالک تھے دلیر سنگھ اور اس کا بھائی شیر سنگھ سکھا ''شاہی'' کے زمانہ میں ان کے اجداد نے مسلمانوں سے زمینیں چھین کر اس علاقہ میں اپنی ''شاہی'' قائم کر لی تھی۔ سکھا شاہی کے خاتمہ کے بعد سے ان کا خاندان اس شاہی کو قائم رکھنے میں کامیاب چلا آتا تھا دلیر سنگھ شہر سیاست میں کافی اثر ورسوخ رکھتا تھا اور شیر سنگھ اس ''شاہی'' کا رعب داب قائم رکھنے کی دیگر ضروریات پوری کیا کرتا تھا۔

بھسین کے سکھوں نے ایک مسلمان تیلی کو اپنے بدمعاشی، امور کا انچارج بنا رکھا تھا۔ ساڑھے چھ فٹ طویل قد جناتی جسم حیوانی غرور تیلی سارے علاقہ میں دہشت کی علامت ہوتا تھا دن کی روشنی میں لوگوں کے کھلیانوں سے گندم اٹھا لے جاتا ان کی تیار فصلوں میں مویشی چھوڑ کر اجاڑ دیتا کوئی اس کے سامنے دم نہ مارتا اپنی بدمعاشی کی سلطنت کو توسیع دینے کے لئے ایک روز وہ بھسین کی سرحدوں سے باہر نکل آیا اور ملک پور کی سرحدوں کے اندر تیار فصلوں میں مویشی ہانک دیئے اور خود لاٹھی زمین میں گاڑھ کر بانہہ سرہانے رکھ کر سو گیا چیلے گلی ڈنڈا کھیلنے لگے ملک علی محمد کو اپنے کھیتوں سے مویشی ہانک کر نکالتے دیکھ کر تیلی لاٹھی لہراتا اور بھنگڑہ ڈالتا اس کی طرف بڑھا ''تیلی آ رہا ہے مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علی محمد کے لئے تیار ہو جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا

چیلے انسان اور جن کا مقابلہ دیکھنے لگے انسان جن پر غالب آ گیا تو جس کسی نے بھی سنا یقین نہ کیا۔ خبر بھسین پہنچی تو سرداروں کی داڑھیاں ہلنے لگیں بدمعاش تیلی کی شکست ان کی اپنی سرداری کی رسوائی تھی سنگتیں میدان کی طرف چڑھ دوڑیں سنگت اندھیری دیکھی تو شیر سنگھ علی محمد کے ساتھ جا کھڑا ہوا، سنگتاں پرامن طور پر اپنا تیلی اٹھا کر پسپا ہو گئیں۔

ایسا دوست علی محمد کے اپنے ہاتھوں میں دم توڑ گیا تھا مگر اسے گولی مارنے والا اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا اور وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

ملک پور اور بھینی تخت لاہور سے صرف دس کوس کے فاصلہ پر ہیں لیکن لاہور سے ملکپور بھینی تک پھیلا جنگل عبور کرتے کرتے مسافر اور خبر دونوں کی شکل وصورت تبدیل ہو جاتی تھی۔ ایک شام خبر پہنچی کہ زخمی تیلی کی زندگی کے چراغ کا تیل بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔ علی محمد کے لئے یہ فکرمندی کی خبر تھی نماز فجر کے بعد پاؤ بھر مکھن برتن میں ڈالا اور جلو کی طرف چل دیا جلو کے قریبی جنگل میں چھپا درویش راوی کے جنگل بیلے سے ہجرت کر کے وہاں گیا ہوا تھا۔ علی محمد خاموش بیٹھا رہا درویش اپنے کام میں مصروف رہا علی محمد کو کچھ عرض کرنے کی جرأت ہوئی نہ درویش نے پوچھا کیوں آئے ہو؟ واپسی کی اجازت لی۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ درویش نے آواز دی ''علی محمد کیسے آیا تھا''؟ علی محمد نے ساری کہانی سنا دی۔ درویش مراقبہ میں چلا گیا واپس آیا تو خبر دی کہ تیلی خیر خیریت سے ہے دعا دی کہ اللہ خیر کرے گا نصیحت کی ''آئندہ اتنا زیادہ کسی کو نہ مارنا جتنا تیلی کو مارا تھا نہ نماز چھوڑنا اور نہ کبھی جھوٹ بولنا۔ اللہ خیر کرے گا۔''

علی محمد عدالت میں کیسے کہتا کہ میں نے کرنیل سنگھ کو اپنی آنکھوں سے گولی مارتے دیکھا تھا۔

کرنیل سنگھ کی ماتا کی وفات کے بعد شیر سنگھ نے ایک ایسی خاتون کے ساتھ پھیرے لئے تھے جسے ماتا کہنا کرنیل سنگھ کو پسند نہ تھا اور جسے گھر سے نکالنا شیر سنگھ کو گوارا نہیں تھا اور اسی باہمی ناگواری میں گولی مارنے تک معاملہ جا پہنچا تھا۔ سردار دلیر سنگھ نے بھی اپنا سارا کانگریسی زور ضلع کچہری کا اثر ورسوخ بھائی کے قاتل کو پھانسی کے پھندے سے بچانے میں صرف کر دیا تھا۔ بھائی قتل ہو گیا بھتیجا پھانسی چڑھ گیا تو شاہی کیسے چلے گی؟ اسے دوہرا غم تھا۔

ایک روز علی محمد نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آیا تو دروازے پر کرنیل سنگھ کھڑا تھا ''آج سے آپ میرے باپو کی جگہ ہیں اپنے چار مسلمان بیٹوں میں ایک سکھ بیٹے کا اضافہ قبول فرمائیں''

علی محمد خاموش رہا جو اپنے اصلی باپو کا نہ بنا وہ منہ بولے باپو کا بن سکے گا؟

کرنیل سنگھ نے خاموشی کو مکمل رضا جان لیا اور پھر منہ بولے باپو کا کبھی کوئی حکم نہ ٹالا۔

بدعورتوں کے لئے بدمعاش مرد دلجیت کور شیر سنگھ کے گھر سے نکلی اور بہادر سنگھ کی حویلی جا پہنچی جو شیر سنگھ کا جونیئر پارٹنر ہوا کرتا تھا اپنے سینئر کی دلجیت کور کا دل جیت لینے سے وہ بالکل ہی شیر سنگھ ہو گیا۔ ''یہ تو بڑی شرم کی بات ہے'' دلجیت کور جیسی بھی ہے تھی تو میری ماں میں بہادر سنگھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا'' کرنیل سنگھ نے علاقہ میں اعلان کر دیا۔

بہادر سنگھ نے سنا تو قہقہہ لگایا ''ابھی تو کرنیل سنگھ کا اپنا منہ چومنے کے قابل ہے''

شیر سنگھ نے اپنے پیچھے تین بیٹے چھوڑے تھے سب سے بڑا کرنیل سنگھ تھا۔ دو چھوٹے تھے جو دلجیت کور کے بھی بیٹے تھے کرنیل سنگھ نے دونوں بھائیوں کو بیٹوں کی مانند پالا پوسا ان دونوں نے اپنے باپ کے قاتل اور ماں کے دشمن کو عمر بھر باپو کی جگہ رکھا اور تینوں نے بہادر سنگھ سے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا مل کر حلف اٹھایا ''عزت اور بے عزتی خاندانوں کی مشترکہ میراث ہوتی ہیں۔''

اٹھتی جوانی، خاندانی وجاہت، امیرانہ وقار اور مونچھ اونچی رکھنے کا عزم بھینی کی سکھ لڑکیاں کرنیل سنگھ کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھیں تو بڑی بوڑھیاں اسے دیکھ کر شیر سنگھ کی یاد میں آہیں بھرنے لگتیں۔

ایک شام پھر کرنیل سنگھ ملکپور کی مسجد کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا نمبردار دیکھ کر قریبی حویلی میں چھپ گیا نمازی باہر آئے کرنیل سنگھ باپو کو ایک طرف لے گیا چند منٹ بعد وہ سینہ تانے گھوڑے پر سوا بیلے کی طرف جا رہا تھا اور علی محمد سر ڈالے اپنی حویلی کی طرف۔

''سنا ہے بہادر سنگھ آخری دموں پر ہے''

''گولی دل کے پاس سے ہو کر نکل گئی ہے''

''کرنیل سنگھ کی بندوق چلی نہیں صرف ایک گولی چل سکی ورنہ اس کا نشانہ خطا نہیں جاتا''

''بہادر سنگھ کو مخبری ہو گئی تھی وہ گھوڑا بھگا کر نکل گیا''

اگلی صبح تک بیلے میں بارہ بارہ کوس تک خبر پھیل چکی تھی اور ہر ڈیرے اور گاؤں میں الگ الگ خبر سنی گئی تھی۔

کرنیل سنگھ کو خبر ملی تھی کہ بہادر سنگھ لاہور گیا ہے وہ اس کی واپسی کے راستہ میں تھڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مار کر بیٹھ گیا۔ گولی بہادر سنگھ کی ٹانگ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ بہادر سنگھ اتنا بھی بہادر نہیں تھا کہ مقابلے میں ڈٹ جاتا۔ اپنے محافظ دستہ سمیت فرار ہو گیا۔

کرنیل سنگھ کو اس ناکامی کا سخت دکھ تھا۔

پولیس کرنیل سنگھ کی تلاش میں نکل پڑی۔ بندوق رکھنا اور ''بہادروں'' کا شکار کرنا انگریز بہادر کی اپنی بہادری کے لئے چیلنج تھا اس نے پولیس کی پوری قوت سے کرنیل سنگھ کا چیلنج قبول کر لیا۔ جنگل بیلے نے کرنیل سنگھ کو حوالہ پولیس کرنے سے انکار کیا تو پولیس اس کے ملازم اور مویشی ہانک لے گئی۔ کئی دن کے آپریشن میں بھی شیر سنگھ کا کوئی بیٹا قابو نہ آیا تو مقبول شاہ کی تھانیداری کا جادو ٹونے میں بدلنے لگا تو ایک دستہ کرنیل سنگھ کے مسلمان باپو کی طرف روانہ کر دیا۔ ''کرنیل سنگھ کہاں ہے؟''

''بیلے میں''

''بہادر سنگھ کو گولی مارنے کے بعد وہ آپ کے پاس آیا تھا؟''

''آیا تھا''

''کیا مشورہ کرنے؟''

''یہ بتانے کہ اس نے بہادر سنگھ کو گولی ماری تھی لیکن بدقسمتی سے وہ بچ گیا ہے''

''آپ سے اور کیا کہا تھا اس نے؟''

''یہ کہ میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکا''

''آپ نے بھی تو اسے کوئی مشورہ دیا ہو گا؟''

''میں نے کہا تم نے اچھا نہیں کیا لیکن جو کچھ ہو گیا اب بہادروں کی طرح اس کا سامنا کرنا''

''اس کا آپ سے کوئی رابطہ ہے؟''

''نہیں''

''اس کی گرفتاری میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں؟''

''نہیں''

کون کون ہے؟ علاقہ میں کون کیسا ہے؟ پولیس کے ریکارڈ میں سب کچھ موجود تھا علی محمد کے ریکارڈ کی روشنی میں حکام نے اس کے خلاف کسی کاروائی سے اجتناب کیا۔

دشمن کے لئے یہ کرنیل سنگھ کے فرار سے بھی بڑا صدمہ تھا وہ اور بھی بڑے حکام کے

سامنے پیش ہو گیا اور مسجد کے دروازے پر کرنیل سنگھ اور علی محمد کے باہمی صلاح مشورہ کی چشم دید رپورٹ پیش کی ''علی محمد کو حوالات میں بند کر دیں کرنیل سنگھ خود ہی حاضر ہو جائے گا''

دوسری صبح پولیس علی محمد کے پاس آئی۔ ''کرنیل سنگھ کی آمد تک آپ کو ہمارا مہمان رہنا پڑے گا''

اسی شام کرنیل سنگھ خود تھانے جا حاضر ہوا۔

رات کو جسمانی تفتیش شروع ہوئی بہادر سنگھ کو گولی مارنے سے انکار ممکن تھا نہ کرنیل سنگھ اس کا انکار کرتا تھا بندوق رکھنا اس سے بھی سنگین جرم تھا تھانیدار کو بندوق کی اشد ضرورت تھی اور کرنیل سنگھ نے بندوق کہاں سے حاصل کی تھی یہ جاننا اور بھی لازم تر ہو گیا تھا ''بندوق کہاں ہے؟''

''راوی کے پاس''

''بندوق لی کہاں سے تھی؟''

''ایک دوست سے''

''کون ہے وہ دوست''

''یہ نہیں بتا سکتا''

''بندوق راوی سے نکال سکتے ہو؟''

''راوی مجھ سے زیادہ طاقتور ہے آپ خود کوشش کر دیکھیں شاید آپ سے ڈر جائے''۔

ساری رات جسمانی تفتیش جاری رہی ساری رات کرنیل سنگھ مقبول شاہ کو گالیاں دیتا رہا

''بندوق دوں تو میں شیر سنگھ کا بیٹا نہیں تم مجھ سے بندوق نہ لو تو تم کسی سید کے بیٹے نہیں''

مقبول شاہ کرنیل سنگھ کے مسلمان بھائی کو پکڑ لایا کرنیل سنگھ فکر مند ہوا۔ ''کچی عمر اور پولیس مقابلہ شاہ نے وارڈ اہڈا کیا ہے''

اندھیرا ہوتے ہی قادا تھانے سے بھاگ گیا گولیاں چلتی رہیں وہ بھاگتا رہا پھر جنگل اور اندھیرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا

کرنیل سنگھ نے سکھ کی سانس لی

ہر نئی رات نئے انداز تفتیش لاتی رہی ہر رات کرنیل سنگھ مقبول شاہ کو نیا چیلنج دیتا رہا۔ ''آج فیصلہ ہو جائے گا کہ تم اصلی شاہ ہو یا میں اصلی سکھ ہوں''۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے حوالاتی اور پولیس کا عملہ کرنیل سنگھ کو اصلی سکھ مان گئے مگر مقبول شاہ کی اصلیت کے بارے میں کوئی رائے دینے کی کسی میں جرات نہ تھی۔

کرنیل سنگھ سزا بھگت کر گھر آیا تو قادا اتحادی امن کے تحفظ کی خاطر انگریزی فوجوں میں شامل ہو چکا تھا امن کو ہٹلر سے بچانے کے لئے انگریز بہادر کو آدمیوں کی اتنی شدید ضرورت تھی کہ وہ یہ بھی نہ پوچھتے کہ کون گھر سے آیا اور کون تھانے سے بھاگ کر امن کے تحفظ کی خاطر بندوق اٹھانے جا رہا ہے۔ پولیس کو قادے کی امن دوستی کا علم ہوا تو اس کا کیس داخل سرکار کر دیا۔

کرنیل سنگھ کے فرائض میں اور بھی اضافہ ہو گیا زخمی بہادر سنگھ سے لازوال دشمنی اور باپو کے سامنے شرمساری مخبر کو وہ دشمنی کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ ''میں دشمنی دوستی سے بھی زیادہ پالتا ہوں مگر ہر کوئی دشمنی کے قابل نہیں ہوتا''

کرنیل سنگھ نے زندگی بھر اپنے آنجہانی باپو کے عزیزوں اور دوستوں کا بے حد احترام کیا۔ اگر کسی پر اپنے باپو سے کسی تعلق کا شبہ بھی ہو جاتا تو وہ اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتا۔

ایچوگل کے سردار صوبا سنگھ سے کرنیل کی صدا ان بن رہی وہ بہادر سنگھ کا طرفدار اور کرنیل اس کا جانی دشمن۔ کوئی مقام اتصال تھا ہی نہیں ایک دفعہ صوبا سنگھ اور انگریز ڈپٹی کمشنر کے درمیان ٹھن گئی ڈپٹی کمشنر نے علاقہ کے جملہ نمبرداروں سفید پوشوں اور ذیلداروں کو واہگہ کے نہر بنگلہ میں طلب فرمایا اور سرکار عالیہ کی اس خواہش سے آگاہ فرمایا کہ ہر گاؤں میں رات کو ٹھیکری پہرہ کا اہتمام کیا جائے گا صوبا سنگھ نے سرکار عالیہ کا ایسا حکم ماننے سے معذوری ظاہر کر دی ''ہم تو چوری ہی اس لئے کراتے ہیں کہ ہمارے گاؤں کے لوگ آرام کی نیند سو سکیں اگر انہوں نے راتوں کو پہرہ دینا ہے تو ہمارے راتوں کو جاگنے اور چوری کرانے کا کیا فائدہ؟''

ڈپٹی کمشنر کو صوبا سنگھ کی بات سمجھ نہیں آئی جب مددگاروں نے اس کا سلیس ترجمہ کر کے جواب اچھی طرح سمجھایا تو ڈپٹی کمشنر کو وہیں بیٹھے بٹھائے اس کی ذیلداری ختم کرنے کا فیصلہ کرنا پڑ گیا صوبا سنگھ نے مونچھوں کو اچھی طرح تاؤ دیا اور باعزت گھر لوٹ آیا۔

تحصیلدار اور پٹواری نئے ذیلدار کی تلاش میں دوڑ پڑے علاقہ میں کسی نے بھی صوبا سنگھ کی مسند پر بیٹھنے پر آمادگی ظاہر نہ کی کرنیل سنگھ کی اس سے دشمنی کے سبب اسے آمادہ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں اس کا ایک ہی جواب ہوتا ''صوبا سنگھ کی پگڑی ڈپٹی کمشنر اتارے اور

کرنیل سنگھ اپنے سر پر رکھ لے؟ میں اس کا کمینہ دشمن نہیں خاندانی مخالف ہوں''

چھ آٹھ ماہ کی ناکام تلاش کے بعد انتظامیہ کو پھر سے صوبا سنگھ کو ہی ذیلدار تسلیم کرنا پڑ گیا تو ڈپٹی کمشنر کی شکست پر صوبا سنگھ کرنیل سنگھ کا شکریہ ادا کرنے آموجود ہوا ''شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے کہ آپ نے مجھے کمینگی سے بچا لیا'' کرنیل نے جواب دیا

کرنیل سنگھ نے صوبا سنگھ کی خوب آؤ بھگت کی جب وہ رخصت ہونے لگا تو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا ''صوبا سنگھ یہ سمجھنے کی کبھی غلطی نہ کرنا کہ کرنیل سنگھ تمہارا دوست بن سکتا ہے میں تمہارا دشمن ہوں اور دشمن رہوں گا''

شادی بیاہ کے قدیم نظام کے تحت وری کا انچارج دولہا کا خاندانی نائی ہوتا تھا دلہن کے لئے کپڑے اور دیگر لوازمات سب اس کے چارج میں رہتے تھے دلہن کے گھر وہی وری کھول کر دکھایا کرتا تھا اور پھر بحفاظت واپس لانے کا ذمہ دار ہوتا تھا نمبردار کے بیٹے کی شادی تھی اس کا خاندانی نائی وری دکھانے گیا تو دلہن کے باپ نے اپنے نائی کو آواز دی ''جلدی سے سردار صاحب کے سر سے صندوق اٹھاؤ تم ہی چھوٹے بڑے کا خیال کیا کرو''

دولہا کا باپ طنز سے پانی پانی ہو گیا اس نے سبب کی تلاش میں اپنے نائی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا مگر طنز کا تیر جو اس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا اس کا نکالنا ممکن نہ تھا بارات ہر طرح سے خیر خیریت سے دلہن لے کر واپس آ گئی وری کا صندوق دولہا کے باپ کے سپرد کر کے اور اپنے لاگ لے کر نائی خوشی خوشی اپنے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جو رات بارات نے دلہن کے گاؤں میں بسر کی تھی اس کے اندھیرے میں اس کا گھر نہایت اچھی طرح لٹ گیا تھا نائی روتا پیٹتا نمبردار کے پاس حاضر ہوا اپنے لٹنے کی داستان المناک پوری تفصیل سے کہہ سنائی ''اور پہنوں تلے دار جوتا'' نمبردار نے طویل لوٹ مار کا مختصر سا جواب دیا۔

نائی کو اپنے گناہ کا علم تو ہو گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

کرنیل سنگھ کو نمبردار کے خاندانی نائی کے لٹ جانے اور نمبردار کے جواب کا علم ہوا تو اس نے نائی کو اپنے ڈیرے پر بلایا اپنے موچی سے اس کے سارے خاندان کے لئے تلے دار جوتے بنوائے۔ ''ایک پورا مہینہ تم سارا خاندان یہی تلے دار جوتے پہنو گے اس آزمائش پر پورے اترے تو تمہارا سارا نقصان میں اپنے پلے سے پورا کر دوں گا''

بھینی ڈھلواں میں زمینوں کے مالک سکھ تھے کچھ محنت کش عیسائی اور مسلمان بھی تھے مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں کسی ہندو کی دکان نہیں تھی۔ ''ان کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ دوست ہیں یا دشمن'' کرنیل ہندوؤں کے بارے میں کہا کرتا تھا۔

محفل میں کسی نے سردار سردول سنگھ کی تعریف کی ''اس کا کوئی دشمن نہیں''۔

''میری تو اس گائے کے بھی دو چار دشمن ہوں گے'' کرنیل سنگھ نے پاس کھڑی گائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''جس کا کسی دشمن نہ ہو وہ سکھ نہیں ہوسکتا میں کسی ایسے سے نہ دشمنی کرسکتا ہوں نہ دوستی کے قابل سمجھتا ہوں''

ایک دفعہ دو عیسائی آپس میں لڑ پڑے اور اپنا مقدمہ کرنیل سنگھ کے دربار میں پیش کیا

''آپ میرے تایا جی کے پاس کیوں نہیں گئے؟''

''یہ اس کا سیپی ہے'' ایک عیسائی نے دوسرے کے بارے میں بتایا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے عدالت تو انصاف کرتی ہے اور تایا جی نے میرے علاوہ ہمیشہ ہر کسی سے انصاف کیا ہے''

''ہم نے سوچا بعد میں جو آپ کے پاس آنا ہے۔۔۔۔''

''میں تایا جی کے فیصلہ کے خلاف اپیل سننے کا مجاز ہوں اس کا مقدمہ نہیں سن سکتا''۔ کرنیل سنگھ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیا۔

اس کے بھائی گاؤں کے عیسائیوں کی شکایت کرتے ''فلاں پانی کی باری پر نہیں گیا فلاں بن پوچھے چارہ کاٹ لے جاتا ہے فلاں کے مویشی کھیت اجاڑ گئے ہیں''

''واہ گورو کا شکر بجالاؤ تم شیر سنگھ کے گھر پیدا ہو گئے پرماتما تمہیں بھی تو کسی عیسائی کے گھر پیدا کر سکتا تھا سوچو پھر تمہارا کیا حال ہوتا'' وہ جواب دیتا۔

مگر وہ کسی ایسے آدمی کو برداشت نہیں کرتا تھا جس کی وفا مشکوک ہو۔ ''کتا وفادار نہ ہو تو لوگ اسے کتا نہیں سمجھتے میں بے وفا کو کیسے آدمی مان لوں''

کرنیل سنگھ نے زندگی بھر ملک محمد علی کے دوستوں کو اپنا دوست اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھا ایچوگل کے سکھوں نے مسلمانوں کو اذان دینے سے روکا تو کرنیل سنگھ نے ملک علی محمد کے ساتھ مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ دونوں خاندانوں کی دوستیاں اور دشمنیاں مشترکہ ہوئیں تو مسلمان اور سکھ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک خاندان معلوم ہونے لگے

یعقوب پیارالی سے ماموں کے پاس آیا شالامار کا میلہ دیکھنے چلا تو ماموں نے دو

بیٹے ساتھ کر دیئے اور کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرنے کی نصیحت پلے باندھ دی

میلے میں لاہوری پہلوان مگدر اٹھا رہے تھے کرنیل نے یعقوب کی طرف دیکھا۔

''پرایا شہر ہے کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو ماموں جوتے لگائیں گے'' یعقوب نے معذرت کی۔

''باپو کے جوتے میں کھالوں گا تم لنگوٹا باندھو ایسی ویسی کوئی ہمارے ساتھ کرے گا؟''

یعقوب مالی جیت گیا

کرنیل نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا جس سکھ نے دیکھا جلوس میں شامل ہوگیا۔ ''اپنا پھوپھی زاد ہے'' وہ پوچھنے والوں کو بھنگڑا ڈال ڈال کر بتاتے جاتے تھے

ہٹلر کی موت سے امن محفوظ ہوگیا تو برصغیر کے غلاموں نے بھی اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر خوب خوشیاں منائیں۔ ان خوشیوں کو اچھی طرح منانے کے لئے انتظامی وسائل فراہم کئے گئے، تحصیلداروں اور پٹواریوں کو استعمال کیا گیا۔ ''ہٹلر مر گیا ہے تو قادا واپس کیوں نہیں آیا'' کرنیل نے ہٹلر کی موت پر چراغاں کرنے سے انکار کر دیا ''قادے کو لاؤ میں پورا مہینہ روشنیاں کروں گا''

قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو کرنیل افسردہ ہوگیا ''اگر میں یہاں رہتا ہوں اور سارے سکھ چلے جاتے ہیں تو دشمنی کس سے رہے گی اگر میں بھی چلا جاتا ہوں تو باپو جی ادھر رہ جائیں گے''

اس کے ماضی اور حال کو دیکھ کر اس کے سکھ دوست طنز کرتے ''تم تو مسلمان سنگھ ہو تم دونوں ممالک کے لئے قابل قبول ہوگے''

وہ مسکرا دیتا

سکھ بارڈر پار چلے گئے کرنیل سنگھ بھینی ہی میں ڈٹا رہا ملک علی محمد بھی اسے کسی طرح کی کوئی فکر نہ کرنے کو کہتے اور کبھی ہندوستان چلے جانے کا مشورہ دیتے ''حالات خراب ہو رہے ہیں یہاں کے مسلمان تو سب جانتے ہیں ادھر سے آنے والا کوئی گڑبڑ نہ کر دے''

''میں آپ کی وجہ سے رہنا چاہتا ہوں اور آپ بھی مجھے یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیتے ہیں''۔

''بعض اوقات مشکل باتیں اور فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں''

ایک بار پھر کرنیل سنگھ ظہر کی نماز کے وقت ملکپور کی مسجد کے دروازے کے سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا تھا گھوڑے پر سوار۔ ملک صاحب مسجد سے باہر آئے تو وہ گھوڑے سے اترا باپو کے پاؤں چھوئے چابیوں کا تھیلا ان کی طرف بڑھا دیا۔ ''آپ کا حکم ہے اور بعض اوقات مشکل فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں''

دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہولے ہولے باتیں کرتے وہ حویلی تک گئے سب کو کرنیل سنگھ کے فیصلے سے آگاہ کیا سب نے ماضی حال اور مستقبل کی باتیں کیں سب کے دل دکھی تھے۔

''میں چلتا ہوں وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے'' اس نے ایک بار پھر باپو کے قدم چھوئے

''میں بھی چلتا ہوں'' ملک صاحب نے گھوڑا تیار کرنے کو کہا

کرنیل نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

ملک علی محمد نے اس کی نظروں کے سوال پر کوئی توجہ نہ دی۔

ملکپور سے چار سوار بھینی کی طرف چلے تو سورج کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا بھینی سے نکلتے نکلتے ستارے نکل آئے دس پندہ افراد کا قافلہ بیس منٹ میں سرحد پر پہنچ گیا۔ ''باپو جی جب تک زندہ ہوں آپ کی ایک آواز پر حاضر ہو جاؤں گا آپ جب بھی آواز دیں گے میں سن لوں گا آپ دیکھ رہے ہیں فاصلہ ہی کیا ہے''۔

''مجھے امید ہے ادھر بھی مسلمانوں کے ساتھ تمہارا وہی سلوک ہوگا جو ادھر مسلمانوں کا تم سے رہا ہے''

''باپو میں تو ہوں ہی مسلمان سنگھ''۔

فضا میں کوئی قہقہہ بلند نہیں ہوا۔

کرنیل نے کرپان پہ ہاتھ رکھ لیا ''یہ کرنیل سنگھ کا باپو سے وعدہ ہے''

تین سوار دیر تک کھڑے رہے بارہ سوار دیر تک مڑ مڑ کر دیکھتے گئے

اور پھر نظروں کے تار ٹوٹ گئے۔

پاک بھارت سرحد پر تب نہ کوئی چوکی تھی نہ پہرا ہوتا تھا پاکستان کے مسافر قافلوں کی حفاظت کے لئے ادھر کے تھانوں کے ناپسندیدہ افراد دور تک نئے نئے ہندوستان کے اندر چلے جایا کرتے تھے اور جو بھی ادھر سے آیا یہی خبر لایا کہ کرنیل سنگھ اپنی ہمت اور حالات کے مطابق وعدہ پورا کر رہا ہے۔

پھر سرحد پر چوکیاں بننے لگیں دونوں طرف گشت شروع ہو گئی سختی اور نگرانی کے ان ہی دنوں میں ملک علی محمد کے ایک دشمن کے سارے مال مویشی چوری ہو گئے۔ چور ایک رقعہ چھوڑ گئے تھے ''میرا نام کرنیل سنگھ ولد شیر سنگھ ہے میں آپ کو صرف یہ بتانے کے لئے یہ مویشی لے جا رہا ہوں کہ میں باپو سے دور نہیں''

باپو نے پہلی بار سخت قسم کی ناراضگی ظاہر کی

''باپو جی ایک دفعہ اور معاف کر دیں کیا معلوم پھر کبھی معافی مانگنا نصیب ہوگا کہ نہیں'' کرنیل سنگھ ملکپور معافی مانگنے آیا

اس آخری معافی کے کئی سال بعد ملک صاحب نے مجھ سے کرنیل سنگھ کے نام خط لکھوایا کرنیل سنگھ نے بہادر سنگھ کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا ملک صاحب نے خط میں بہادر سنگھ کے بیٹے کے قتل پر خوشی کا اظہار کیا تھا نہ افسوس کا۔ انہیں صرف یہ دکھ تھا کہ اس مصیبت میں وہ کرنیل سنگھ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ''ویزہ مل نہیں رہا کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آتا؟''

☆☆☆☆☆